توحید

مثبت انتظار
شیطانی سازشیں
قرآن عظیم ترین الٰہی تحفہ
تہذیب نفس کے ذریعہ انبیاءؑ کی پیروی
معاد - انبیاءؑ، اولیاء اور حکماء کی نظر میں

رسول اکرم(ص) نے فرمایا

حسین چراغِ ہدایت اور کشتیِ نجات ہیں

جلد ۷ شمارہ ۲
رجب - شعبان ۱۴۱۰ھ
فروری - مارچ ۱۹۹۰ء

اسلامی،
علمی،
فکری،
دوماہی رسالہ

توحید

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۷ ڈالر

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ - ادارہ۔

خطاطی و ڈیزائن: صادق علی فنی اسکردوی

اسلامی،
علمی،
فکری
دوماهی رسالہ

توحید

جلد ۷ شمارہ ۲

ترتیب

شذرہ

مثبت انتظار — مدیر — ۵

قرآن

بیان تفسیر — جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل — ۹

فکر و فلسفہ

عرفان — استاد شہید مرتضیٰ مطہری — ۱۷
قرآن میں انبیاءؑ کے جلوے — شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر — ۲۷

مجلہ توحید (اردو)
پوسٹ بکس ۳۴۵۵ - ۳۷۱۸۵
قم
جمہوری اسلامی ایران
فون : ۲۸۴۱۸

رجب، شعبان ۱۴۱۰ھ / فروری - مارچ ۱۹۹۰ء

تہذیب نفس کے ذریعہ انبیاء کی پیروی | جناب جوادی آملی | ۵۷
معاد - انبیاءؑ، اولیاء اور حکما کی نظر میں | جناب حسین نوری | ۶۵
قرآن عظیم ترین الٰہی تحفہ | جناب محمد تقی مصباح | ۷۳
حکومت کے ارکان | جناب محمد تقی رہبر | ۹۱
امامت و رہبری | استاد شہید مرتضیٰ مطہری | ۱۱۱
شیطانی سازشیں | سازمان تبلیغات اسلامی | ۱۲۳

تاریخ و سیر

رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں | علامہ طباطبائی طاب ثراہ | ۱۴۳
طبری کا مذہب | جناب رسول جعفریان | ۱۵۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

○ مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شـــذرہ

مثبت انتظار

منجی بشریت حضرت بقیۃ اللہ الاعظم امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف وہ متفق علیہ شخصیت ہیں جنھیں شیعہ وسنی دونوں ہی ملتے ہیں۔ دنیا سے ظلم وستم فساد وتباہی کے خاتمہ اور عدل وانصاف، مہر ومحبت کی فضا قائم ہونے کے سلسلہ میں آپ کی ذات سے لو لگائے ہوئے دونوں ہی فرقے اپنے اپنے طور پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ایک آپ کے پردہ غیبت سے نکلنے کا انتظار کر رہا ہے تو دوسرا آپ کی ولادت کا۔

ہر مسلمان ایک ایسے شخص کے انتظار میں گھڑیاں شمار کر رہا ہے جو مرسل اعظمؐ کے خاندان میں سے ہے اور خداوند عالم کے حکم سے اس دنیا میں آکر پوری دنیا پر علم وعدل کی حکومت قائم کرے گا۔ اخوت وبرادری، الفت ومحبت کی بنیادوں کو مستحکم بنا کر سسکتی ہوئی انسانیت کو نجات دے گا۔ اس کے دور میں انسان مصیبتوں، پریشانیوں اور الجھنوں سے آزاد ہو جائے گا

قرآن کریم اس تابناک مستقبل کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ انھیں اسی طرح زمین کی خلافت وحکومت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے کے (مومن وصالح) لوگوں کو نواز چکا ہے۔ اللہ کے پسندیدہ ان کے دین کو مستحکم بنا دے گا، ان کی پریشانیوں، بے چینیوں اور خوف وہراس کو سکون واطمینان

سے بدل دے گا۔اس وقت یہ لوگ صرف خدا کی پرستش کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہیں دیں گے۔

☆☆☆

انتظار تو سبھی کر رہے ہیں۔سب کو ایک مصلح کا انتظار ہے۔لیکن انداز ذرا بدلا ہوا ہے۔اگر کچھ منتظر ایسے ہیں جو اپنے آنے والے قائد اور اپنے پسندیدہ معاشرہ کے قیام کے لئے زمین ہموار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں جو تمام اصلاحات کی ذمہ داری اپنے موعود پیشوا پر ڈال کر خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس کے انتظار کا نعرہ بلند کرتے رہنا ہی اپنا واحد فریضہ تصور کرتے ہیں اور بعض تو اتنے ستم ظریف ہیں جو امام (عج) کی آمد سے پہلے ہر قسم کے اصلاحی اقدام کو ظہور امام (عج) کی راہ میں رخنہ اندازی سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں دنیا میں جتنا فسق و فجور بڑھے گا، جتنا ظلم وستم میں اضافہ ہوگا اتنی ہی حضرت (عج) کے ظہور میں تعجیل ہوگی!!

کون سی تعبیر درست ہے؟ پہلی، دوسری یا تیسری؟ ہمارے ائمہ معصومین ؑ نے کس قسم کے انتظار کی دعوت دی ہے؟ مثبت انتظار یا منفی انتظار؟

جب ہم اپنی گذشتہ تاریخ اور اپنے ائمہ اطہار ؑ کی سیرت و سنّت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ ہمارے انتظار کو منفی انتظار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہمارا انتظار ولولہ انگیز، امید افزا اور آزادی بخش انتظار ہے۔یہ وہ انتظار ہے جس نے ہمارے معاشرہ کو اس طویل اور پرپیچ تاریخ میں شدید مخالفتوں اور عظیم مصیبتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ ترقی سے نہیں روکا بلکہ اسے شاہراہ ترقی پر گامزن بھی کیا اور اس کی بقا کا راز بھی یہی انتظار ہے۔

یہ وہ انسان ساز انتظار ہے جو ایک مردہ و بے جان ملّت سے ایک زندہ قوم، پریشاں حال و نامنظم معاشرہ سے منظم و خوش حال سماج، افسردہ انسانوں سے خوش و خرم انسان، غیر مطمئن و پرآشوب بشریت سے مطمئن و پرسکون انسانیت، تاریخ کے تاریک مستقبل سے تاریخ کا تابناک مستقبل بناتا ہے۔

امام جعفر صادق ؑ سچے انتظار کرنے والوں کے اوصاف اور ان کے کیفیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو لوگ قائم آل محمدؐ (عج) کی حکومت کے انتظار میں زندگی بسر کر رہے ہوں وہ ان لوگوں کے مانند

ہیں جو حضرت (عج) کے ہمرکاب ہیں ۔۔۔

بلکہ ان لوگوں کے مانند ہیں جو آپ کے ہمراہ راہ خدا میں شمشیر زن ہیں ۔۔۔ نہیں بلکہ خدا کی قسم وہ ان شہیدوں کے مانند ہیں جنھوں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں پیغمبر اسلامؐ کی رکاب میں قربان کردی۔

اس دُرِ بے بہا نے، انتظار کے چہرے سے نقاب اٹھادی۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ سچے منتظر صدر اسلام کے مومنین اور عصرِ ظہور کے مجاہدین جیسے ہیں۔ انھیں صدر اسلام کے مجاہدوں کی طرح اپنے دور کے جاہلی ماحول میں، بنی آدم کو تباہی و بربادی کے دہانے سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے۔ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھرنے کے لئے جد وجہد کرنی چاہیئے۔ ظالم سے مظلوم کا حق دلانے کے لئے جہاد کرنا چاہیئے۔ مظلوم کا ساتھی اور ظالم کا دشمن ہونا چاہیئے۔ معاشرہ کو الٰہی اور اسلامی حکومت کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وستم کے خاتمہ کے لئے آخری حد امکان تک سعی کرنی چاہیئے، مختصر یہ کہ حضرت مہدی (عج) کی غیبت کے اسباب و علل کو دور کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دینی چاہیئے۔

امام صادق ؑ ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

"جو شخص ہمارے امر (حکومت) کا منتظر ہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو راہِ خدا میں اپنے خون میں غوطہ ور ہو۔"

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں "ظہور کا انتظار ظہور کا جزو ہے" یعنی ایک باخبر، ہوشیار اور سچے منتظر کا فرض ہے کہ زمانۂ غیبت میں ایسے کردار کا حامل ہو گویا خود حضرت مہدیؑ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان حدیثوں سے پیغمبر اسلامؐ کے اس قول کا مفہوم اور اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "میری امت کا بہترین عمل ظہور کا انتظار ہے"

☆☆☆

ایک مثال کے ذریعہ بات اور واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے ایک بہت بڑی فوج کا سربراہ کسی معقول ضرورت کے تحت کسی نامعلوم نقطہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ واپسی کا وقت معین نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور بتا جاتا ہے کہ میری واپسی کے بعد فیصلہ کن اور گھمسان کی جنگ ہوگی۔ مجھے سچے جانباز اور وفادار سپاہیوں کی ضرورت ہوگی۔ سچ بتائیے ایسے میں اس کے چاہنے والے سپاہیوں کا کیا فریضہ ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اونگھتے رہیں گے یا اپنے کو پوری طرح چوکس رکھیں گے کہ سردار لشکر کے آتے ہی بلا جھجک اس کے ایک اشارہ پر سر دھڑ کی بازی لگا دیں؟ ہر ذی شعور انسان یہی کہے گا کہ فوج کو نہ صرف اپنی سابقہ طاقت بحال رکھنا چاہیئے، بلکہ دشمن

کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں اسے بھی اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ ایک بیدار، ذی شعور اور وفادار فوج شب و روز اپنے سردار کی کامیابی کے لئے زمین ہموار کرنے میں مشغول رہے گی۔ اگر اشکوں سے لبریز آنکھوں اور مشتاق دلوں کے ساتھ اپنے سردار کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوگی تو اپنے سارے امکانات کو بروئے کار لاکر خود کی تربیت اور اپنے کو سردار کی خدمت کے لائق بنانے میں مصروف بھی ہوگی۔ وفادار فوج یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ وہ غفلت کی نیند سوتی رہے یہاں تک کہ خود سالار لشکر واپس آکر تمام مسائل حل کرے اور ہم آرام سے بیٹھے صرف اس کی محبت کا راگ الاپتے رہیں۔ جنگ وہ کرے فاتح ہم کہلائیں جہاد وہ کرے آزادی ہمیں ملے۔ میدان میں وہ جائے عزت کا تاج ہم پہنیں۔ جام شہادت وہ پئے زندگی جاوید ہمیں ملے.. اسی لئے کہا گیا ہے کہ "کسی مصلح کا انتظار کرنے والی قوم کو خود بھی صالح ہونا چاہیئے"۔

ہم شیعوں میں جو یہ رسم ہے کہ حضرت قائم آل محمد (عج) کا نام سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہم ہر وقت آمادہ ہیں۔ حضرت کے ہر اشارہ پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار رہیں۔

☆☆☆

آج اگر ہمارا انتظار سچا انتظار ہے تو ہم کو صالح فرد اور صالح قوم ہونا چاہیئے، ہمارے وجود کے ہر ہر ذرہ کو ظہور مہدی کے لئے چشم براہ ہونا چاہیئے، ہمارا کردار و گفتار، ہمارا قول و فعل "مہدی (عج) پسند" ہونا چاہیئے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔ اٹھتے بیٹھتے حضرت (عج) کا نام لینا اور متعلقہ دعاؤں کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ زبان سے آپ کے ظہور کی تمنا اور عمل سے آپ کے ظہور کے لئے رکاوٹیں کھڑی کرنا یہ محبت نہیں منافقت ہے، یہ انتظار نہیں دھوکا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم امام کے ظہور کا انتظار کر رہے ہوں اور اس حکومت و انقلاب سے لاپرواہ یا خدانخواستہ اس کے مخالف ہوں جو آپ کی عالمی حکومت کے لئے میدان ہموار کر رہا ہو۔ خواجہ نصیر الدین کے بقول "حضرت کی غیبت کا سبب ہم ہیں"

ہم نے اسلامی تعلیمات کو فراموش کر کے۔ اپنے زمانہ کے امام (عج) اور ان کے نظام حکومت کو نہ پہچان کر ایک ایسا ماحول اور معاشرہ بنا رکھا ہے جس میں آپ کے مقدس وجود کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

آیئے ہم اس امام (عج) کی معرفت حاصل کریں۔ اس کی غیبت کے راز کو سمجھیں، اس کی حکومت کے نظام سے آشنا ہوں اور سب مل کر یہ عہد کریں کہ اسلام کے قوانین پر عمل نیز اپنی اور اپنے سماج کی اصلاح کر کے امام (عج) کے ظہور کی راہ ہموار کریں گے۔

جناب مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ نساء : ۲۰ - ۲۳

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ
اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ
قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ
اِثْمًا مُّبِيْنًا ۞ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ
اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۞

ترجمہ

اور اگر تم یہی ارادہ کر لو کہ موجودہ بیوی کے بجائے دوسری بیوی لاؤ۔ اور اس بیوی کو (مہر میں) بڑی بھاری رقم دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم وہ مال بہتان اور بر ملا گناہ کے ذریعے لے لو گے؟ (۲۰) اور تم مہر کیسے لو گے! حالانکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے

اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط پیمان بھی حاصل کر لیا ہے

﴿۲۱﴾

تفسیر

۲۰ ــــــــــ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ . . . . .

قِنطَار : سونے چاندی کا ڈھیر ، بوری بھر کر مال

میثاق غلیظ : پختہ عہد و پیمان اور بروایت امام محمد باقر علیہ السّلام میثاقِ غلیظ سے مراد شوہر سے یہ معاہدہ ہے کہ " امساک بمعروف اور تصریح باحسان " کی پابندی ہوگی ، رکھے گا تو حسنِ سلوک کے ساتھ ، چھوڑے گا تو احسان کے ساتھ (نور ثقلین)

گذشتہ آیت میں " فَاحِشَةً مُبَيِّنَةً " ، کھلی برائی کو جرمانہ وصول کرنے کی ایک راہ بنایا ہے ۔ اس آیت میں اس کی پوری حقیقت بیان ہو رہی ہے ۔

مہر ، ھدیہ محبت ہے واپس نہیں لیا جا سکتا ۔

ایک رسم تھی کہ پہلی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے اس سے جتنا دیا ہوا مہر وصول کر سکتے تھے اینٹھ لیتے تھے ، پھر دوسری شادی کرتے تھے پھر وہی حاصل کردہ رقم یا اس میں کچھ ملا کر نئی بیوی کو مہر ادا کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں اگر وہ عورت سختی کرتی تو اس پر نافرمانی ، بداخلاقی حتیٰ کہ بدکاری کا الزام لگانے سے گریز نہ کرتے تھے ۔ وہ عورت جان چھڑانے اور عزت بچانے کی خاطر رد کا مطالبہ بادل ناخواستہ منظور کر لیتی تھی ۔ اسلام نے اس ظالمانہ رویہ کے خلاف عورت کی حمایت کی اور مردوں کو اس غلط کاری سے روکا ۔

جب ایک عورت تم سے شادی کر چکی اور تم نے اس کا حق دے دیا ، قانون نے اس پیمان کو جائز قرار دے دیا تو اب نکاح باقی رہے یا طلاق کی نوبت آ جائے کسی شوہر

کو دیا ہوا مہر پورا یا جزوی واپس لینے کا حق نہیں۔ زبردستی اور الزام تراشی و بہتان طرازی کر کے لینا اور ظالمانہ برتاؤ کرنا جائز نہیں ہے۔ عورت اس لئے نہیں ہے کہ وہ ظلم کا نشانہ بنائی جائے۔ ہرگز یہ جائز نہیں۔ گناہِ عظیم ہے۔

۲۱ ـــــــ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ - - - -

مہر، نذرانہ خلوص وفا ہے۔ اس کی واپسی کا خیال۔ مرد کی دون ہمتی اور خلاف دانش بات ہے، بھلا کوئی صاحبِ عقل و ہوش پیامِ محبت اور باہمی اُلفت و موانست، لُطف اندوزی و یگانگت کے بعد جلوت و خلوت میں سب کچھ کر گزرنے کے باوجود، یوں آنکھیں پھرا سکتا ہے؟ اور باہمی عہد و پیمان اس طرح پامال کر سکتا ہے کہ ایک محبوب کو چھوڑتے وقت اس کی ملکیت سے کچھ حاصل کرے اور بندھن توڑنے کے لمحے اس قدر ہلکے پن پر اُتر آئے۔ اسلام اور انسانیت ایسے فرد کو ہرگز قبول نہیں کرتی۔

پہلی آیت میں "اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ" اور دوسری آیت میں "وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ" بڑی نفیس تعبیریں ہیں۔ جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ شوقیہ بیوی بدلنے کا ارادہ ہے پھر بھی پہلی رفیقۂ حیات کے مال پر نظر ہے۔ کتنی بُری بات ہے۔

اور مہر پر نظر اس وقت لگی، جب تنہائیوں میں سب کچھ کرتے رہے، دل و جان ایک ہونے کے بعد، یہ سوچنا کس قدر گھناؤنا کام ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۟

ترجمہ

اور نکاح نہ کرو ان عورتوں سے جن سے تمہارے باپ

(دادا) نے نکاح کیے ہوں۔ مگر وہ جو پہلے ہو چکے یہ عمل
بے ہودہ اور غضب الٰہی کا باعث اور برا راستہ تھا (۲۲)

تفسیر

یہ رسم بد بھی قابل گرفت تھی کہ بیٹے اپنے باپ دادا کی منکوحہ سے نکاح کر لیتے تھے۔ چنانچہ مدینے میں ایک ایسے معاملے کی آں حضرتؐ کو اطلاع دی گئی۔

شان نزول

ابو قیس بن سلت انصاری فوت ہوئے تو ان کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں کبیشہ بنت معن سے نکاح کرنے کی ٹھانی۔ کبیشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا کر کہا کہ اسے نہ تو شوہر کی میراث سے اس کا حصہ دیا گیا ہے نہ گھر والے آزادی دیتے ہیں۔ ابو قیس کا بیٹا تو اس سے نکاح کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس پر یہ وحی آئی۔

حکم ہوا کہ سوتیلی ماں (ہو یا دادی، نانی) سے خبردار نکاح نہ کرنا، اس سے معاشرتی اور عائلی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ فحش کام ہے کہ باپ کی ہتک حرمت کی جائے۔ نفرت و غضب کا باعث ہے۔ ایسے رشتے کے فرزند کو "مقیت" کہا جاتا تھا۔ یہ عمل بے راہ روی ہے

حُرمت

عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ
وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ
الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ
نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ
الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

تم پر حرام کی گئی ہیں: تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں۔ اور بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری وہ مادر جلو لڑکیاں جو تمہاری گودیوں میں تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن بیویوں سے تم نے ہم بستری کی لیکن اگر تم نے ہم بستری نہیں کی تو ان کی لڑکیوں سے (نکاح میں) کوئی گناہ نہیں۔ اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں۔ اور دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا۔ مگر جو ہو چکا وہ ہو چکا بے شک اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۳)

تفسیر

مَحرَم عورتیں :-

خواتین کو نکاح کرنے نہ کرنے کے لحاظ سے دو ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ نامَحرَم ــ اور مَحرَم ــ مَحرَم وہ عورت جس سے عقد حرام ہے۔ جمع ہے مَحارِم ــ اس ایک آیت میں مَحارِم کو جمع کر دیا گیا ہے۔ گذشتہ آیات میں جائز نکاح اور غلط انداز طلاق، پھر سوتیلی ماں سے حرمتِ نکاح کا بیان تھا، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ عورتیں کون ہیں جن سے نکاح نہیں کیا جا سکتا محارم کی مجموعی صورت دیکھ کر ان کی منطقی تقسیم یوں کی گئی ہے:

(۱) ــــ ولادت ــــ نسبی رشتہ ــ
(۲) ــــ دودھ شریک ــــ رضاعی رشتہ ــ

(۲) ازدواج ـــ سببی رشتہ۔

(۱) ــــ نسبی رشتے کی بنا پر درج ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے۔

(الف) ــــ اُمّہاتکم :-

(i) خود اس شخص کی ماں اور ماں کی ماں ۔ (ii) دادی، پردادی، سکڑدادی اوپر تک ... (iii) نانی، پرنانی، سکڑنانی اوپر تک۔

(ب) ــــ بناتکُم :-

(i) اس شخص کی بیٹی ۔ (ii) نواسی، کوانسی نیچے تک ۔ (iii) پوتی، پروتی نیچے تک ۔

(ج) ــــ اخواتکُم :-

(i) حقیقی بہن ۔ (ii) پدری بہن ۔ (iii) مادری بہن ۔

(د) ــــ عمّاتکُم ۔ پھوپھیاں :-

i باپ کی حقیقی بہن ۔ ii باپ کی پدری بہن ۔ iii باپ کی مادری بہن ۔ اوپر تک ۔

(ھ) ــــ خالاتکم ۔ خالائیں :-

(i) ماں کی حقیقی بہن (ii) ماں کی پدری بہن (iii) ماں کی مادری بہن ۔ اوپر تک ۔

(و) ــــ بناتُ الاخ ۔ بھتیجیاں :-

(i) بھائی کی لڑکی (ii) بھتیجی کی لڑکیاں ۔ نچلی کڑی تک (iii) بھتیجے کی لڑکی ، نچلی کڑی تک ۔

(ز) ــــ بناتُ الاخت ۔ بھانجیاں :-

(i) بہن کی لڑکیاں (ii) بھانجیوں کی لڑکیاں ۔ آخری کڑی تک (iii) بھانجے کی لڑکیاں ، نچلی کڑیوں تک

② ___ دودھ شریک = رضاعت :-

وہ رشتے جو دودھ پینے پلانے کے ذریعے قائم ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک ہے :-

یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔

دودھ پینے کے رشتے سے بھی وہی محارم ہیں جو نسب سے محارم ہیں۔

رضاعت

دودھ پلانا۔ اصطلاحِ فقہ میں : کسی ایسی خاتون کا کسی بچے کو دودھ پلانا جس کے موجود شوہر سے اسے حمل ہو یا اس کا بچہ آغوش میں ہو۔ اس شوہر سے نکاح دائم ہو یا منقطع۔

بچہ اتنا دودھ پیے کہ اس کی ہڈیاں مضبوط اور گوشت پیدا ہو۔ دودھ پینے والا بچہ دو سال یا اس سے کم ہو۔ لیکن یہ گفتگو صرف تعارفی ہے۔ اصل احکام و حدود کتبِ فقہ میں دیکھنا ضروری ہے۔

رضاعت شرعی ثابت ہونے کے بعد :-

① ___ امہاتکم اللاتی ارضعنکم :-

دودھ پلانے والی ماؤں سے نکاح حرام ہے۔ اس سلسلہ میں نسبی ماں کا سلسلہ دیکھئے۔

② ___ واخواتکم من الرضاعۃ تمہاری رضاعی بہنیں

یعنی نسبی اور رضاعی دونوں طرح کی بہنیں، اور ان کی اولاد حسب تفصیل کتب فقہ۔

③ ___ ازدواجی رشتے :-

اس سلسلے میں چار قسموں کا تذکرہ ہے۔

(الف) ___ وامہات نسائکم :-

بیویوں کی مائیں ۔ بیوی نکاحی ہو یا تماعی ۔ ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو ۔ ماں رضاعی ہو یا نسبی حسب تفصیل کتبِ فقہ ۔

(ب) ـــــ وَرَبَائِبُكُم :۔

بیویوں کی لڑکیاں ۔ یعنی پہلے شوہر کے صلب کی لڑکی ۔ اس لڑکی کی لڑکی نچلی کڑی تک ۔ پہلے شوہر کے لڑکے کی لڑکی نچلی کڑی تک ۔

ـــــ مِن نِّسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ : ـــــ

یہ حرمت اس وقت نافذ ہوگی جب اس بیوی سے ہم بستری کی ہو ۔ بہ تصریح بعد :

ـــــ اِن لَّم تَكُونُوا دَخَلْتُم بِهِنَّ : ـــــ

اگر ان سے ہم بستری نہ کی ہو تو ان رشتوں پر پابندی نہیں ہے

(ج) ـــــ حَلَائِلُ اَبْنَائِكُم :

اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں ۔ پوتے کی بیویاں ، نواسے کی بیویاں ۔ اسی طرح نچلی کڑیوں تک ۔ اس طرح منہ بولے بیٹے کی بیوی کے لئے حکم حرمت نہیں ہے ۔

(د) ـــــ وَاَن تَجْمَعُوا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ

ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں لانا اور زوجیت میں رکھنا ۔ دونوں بہنیں ، حقیقی ہوں ، یا پدری یا مادری یا رضاعی ۔

ـــــ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ، ـــــ

اس قانون سے پہلے جو ہو چکا اسے نظر انداز کر دیا گیا ۔ یہ اس لیے کہ قانون جاری کرنے والا حاکم ، اللہ عزاسمہٗ غفور و رحیم تھا اور ہے ۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: جناب ابو جواد

اسلامی علوم کا تعارف

عرفان

۱

عرفان اور تصوف

ایک اور علم جس نے اسلامی ثقافت کے دامن میں آنکھیں کھولی ہیں اور اسی کے سایہ میں پروان چڑھا ہے، علم عرفان ہے۔

عرفان کے بارے میں دو پہلوؤں سے بحث و گفتگو کی جاسکتی ہے: ایک سماجی پہلو سے اور دوسرے ثقافتی پہلو سے۔

مفسروں، محدثوں، فقیہوں، متکلموں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور اسلامی ثقافتی طبقات سے تعلق رکھنے والے اسی قسم کے دیگر افراد سے "عرفا" کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ ثقافتی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے عرفان نامی ایک علم کی داغ بیل ڈالی ہے۔ بڑے بڑے دانشور ان کے یہاں پیدا ہوئے ہیں اور بڑی اہم کتابیں تالیف کی ہیں ان سب کے باوجود انھوں نے اسلامی دنیا میں ایک ایسے سماجی فرقہ کی بنیاد بھی رکھی ہے، جس کے خود اپنے مخصوص اصول ہیں۔ جبکہ فقہا و حکما جیسے دیگر ثقافتی حلقوں نے ایسا نہیں کیا ہے انھوں نے کوئی سماجی طبقہ تیار نہیں کیا، ان کا تعلق صرف اور صرف ثقافت سے ہے انھیں دوسروں سے الگ کوئی فرقہ نہیں کہا جاتا۔

اہل عرفان کا تذکرہ جب ان کے ثقافتی پہلو کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے تو انھیں "عرفا" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جب ان کا سماجی پہلو مقصود ہوتا ہے تو عام طور سے انھیں "صوفیا" کا لقب دیتے ہیں۔

عرفا و صوفیا کو اگرچہ اسلام کے اندر ایک مذہبی فرقہ نہیں سمجھا جاتا اور خود وہ لوگ بھی اس قسم کی تفریق کے دعویدار نہیں ہیں اور یہ حضرات تقریباً تمام اسلامی فرق و مذاہب میں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسا سماجی گروہ تشکیل دے رکھا ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ کچھ مخصوص افکار و نظریات، یہاں تک کہ نشست و برخاست، میل جول خانقاہوں میں سکونت، سر و صورت کی آرائش اور کپڑے وغیرہ پہننے میں کچھ مخصوص آداب و رسوم کی رعایت نے انھیں ایک مخصوص مذہبی و اجتماعی فرقہ کا رنگ دے دیا ہے۔

البتہ ہمیشہ اور ہر دور میں کچھ ایسے عرفا بھی گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں — خاص طور سے شیعہ مذہب میں — جو ظاہری طور پر دوسروں سے کوئی فرق نہیں رکھتے، جبکہ وہ عرفانی سیر و سلوک کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ سچے اور حقیقی عارف یہی افراد ہیں، نہ کہ وہ ٹولیاں جنھوں نے سیکڑوں آداب و رسوم گڑھ کر بدعتیں ایجاد کی ہیں۔ اسلامی علوم کے کلیات سے متعلق ان دروس میں ہمیں عرفان کے اجتماعی فرقہ جاتی یا درحقیقت اس کے تصوفی پہلو سے کوئی سروکار نہیں، ہم صرف اس کے ثقافتی پہلو کا جائزہ پیش کریں گے۔ یعنی ہم عرفان کو ایک علم اور اسلامی ثقافت کی ایک تاریخ کے عنوان سے مورد بحث قرار دے رہے ہیں۔ ایک طریقہ اور روش کے لحاظ سے نہیں جس کی ایک سماجی فرقہ پیروی کرتا ہے۔

اگر ہم اجتماعی پہلو سے بحث کرنا چاہیں تو اس فرقہ کے وجود میں آنے کے اسباب و علل، اسلامی معاشرہ میں اس کے مثبت یا منفی، مضر یا مفید اثرات، اس فرقہ اور دیگر اسلامی فرقوں کے درمیان رونما ہونے والے عمل ورد عمل یا اسلامی معاشرہ پر اس کے نقوش اور دنیا میں اسلام کی نشر و اشاعت میں اس کے کردار کا جائزہ لینا ضروری ہوگا لیکن سر دست ہم ان مسائل کو نہیں چھیڑنا چاہتے۔ فی الحال عرفان کے بارے میں ہماری بحث ایک علم اور ایک ثقافتی شعبہ کی حیثیت سے ہے۔

ایک علمی و ثقافتی مجموعہ کی حیثیت سے عرفان کے دو شعبے ہیں: عملی شعبہ اور نظری

شعبہ عملی شعبہ سے مراد وہ حصہ ہے جو انسان کے کائنات، خدا اور خود اپنے ساتھ روابط و فرائض کو بیان اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

اس شعبہ میں عرفان کی حیثیت، اخلاق جیسی ہے یعنی وہ کچھ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ـــ جسے ہم بعد میں بیان کریں گے ـــ ایک عملی علم ہے۔

عرفان کے اس حصہ کو "سیر و سلوک" کا علم کہا جاتا ہے۔ اس حصہ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ "سالک" کو انسانیت کی بلند ترین چوٹی یعنی "توحید" تک پہنچنے کے لئے کہاں سے سفر شروع کرنا چاہیئے نیز ترتیب وار کن منازل و مراحل کو طے کرنا چاہیئے اور درمیان راہ مختلف منزلوں میں اسے کیسے کیسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور کس کس طرح کے واردات اس پر طاری ہوں گے۔ البتہ ان تمام مرحلوں اور منزلوں کو ایک ایسے باتجربہ انسانِ کامل کی نگرانی میں طے کرنا چاہئے جو پہلے اس وادی سے گزر چکا ہو اور ان منزلوں کے آداب سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر سر پر کسی انسانِ کامل کا سایہ نہ ہو تو گمراہی کا خطرہ سامنے ہے۔

عرفا نے اس انسان کامل کو جس کی مصاحبت و پیروی "نئے راہیوں" کے لئے ضروری ہے کبھی "طائر قدس" سے تعبیر کیا ہے اور کبھی "خضر" سے ع

ہمتم بدرقہ راہ کن ای "طائر قدس"	کہ دراز است رہ مقصد و من "نوسفرم"
ترک این مرحلہ بی ہمرہی "خضر" مکن	ظلمات است بترس از خطر گمراہی

البتہ وہ توحید جسے عارف، انسانیت کی بلند ترین چوٹی تصور کرتا ہے اور جو عارف کی سیر و سلوک کا آخری مقصد و ہدف ہے عام افراد کی توحید حتی کہ فلسفیوں کی توحید ـــ یعنی واجب الوجود صرف اور صرف ایک ہے ـــ سے بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں توحیدوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عارف کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ موجودِ حقیقی صرف خدا ہے، خدا کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "نمود" ہے "بود" نہیں۔ پرتو اور جلوہ ہے، ہستی و وجود نہیں۔ عارف کی توحید کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"۔

عارف کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان راستوں کو طے کرکے اس منزل پر پہنچ جائے جہاں خدا کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

توحید کے اس مرحلہ کو عارفوں کے مخالف تسلیم نہیں کرتے اور بعض اوقات اسے کفر والحاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن عرفا کا خیال ہے کہ حقیقی توحید تو بس یہی ہے۔ اس کے علاوہ توحید کے دیگر تمام مراتب شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان کے خیال میں اس مرحلہ تک رسائی عقل و فکر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ دل، مجاہدت، سیر و سلوک اور تصفیہ و تہذیب نفس کا کام ہے۔

بہر کیف عرفان کا یہ شعبہ عملی عرفان کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے وہ علم اخلاق کے مانند ہے جہاں "کیا کرنا چاہیئے" کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ :-

اولاً : عرفان، انسان کے خدا، کائنات اور خود اپنے آپ سے تعلقات کے بارے میں بحث کرتا ہے اور زیادہ تر اس کی توجہ انسان اور خدا کے روابط پر مرکوز ہے، جبکہ تمام اخلاقی نظام، انسان اور خدا کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کے بارے میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے صرف مذہبی اصولوں پر استوار اخلاقی نظام ہی اس طرف توجہ دیتا ہے۔

ثانیاً : عرفانی سیر و سلوک — جیسا کہ ان دونوں لفظوں کے مفہوم سے واضح ہے — متحرک ہے، جبکہ اس کے برخلاف اخلاق ساکن ہے، یعنی عرفان میں ایک نقطہ آغاز، ایک مقصد اور ان منازل و مراحل سے گفتگو کی جاتی ہے جنھیں منزل آخر تک پہنچنے کے لئے سالک کو ترتیب وار طے کرنا ہوتا ہے۔

عارف کی نگاہ میں، کسی قسم کے مجاز کے ہلکے سے شائبہ کے بغیر سچ مچ انسان کے لئے ایک "صراط" ہے جس سے گزرنا اور منزل بہ منزل اسے طے کرنا ضروری ہے اور پچھلی منزل طے کئے بغیر اگلی منزل تک رسائی ناممکن ہے

چنانچہ عارف کی نگاہ میں انسان کی روح کی مثال ایک پودے یا ایک بچے جیسی ہے اور اس کا کمال وارتقاء یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص نظام کے تحت رشد و نمو کے مراحل طے کرے۔ لیکن اخلاق میں صرف صداقت، امانت، عدالت، عفت، احسان، انصاف اور ایثار وغیرہ جیسی کچھ فضیلتوں سے بحث کی جاتی ہے کہ روح کو ان اوصاف سے آراستہ و پیراستہ ہونا چاہیئے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے انسان کی روح اس گھر کے مانند ہے جسے نقش و نگار اور کچھ دوسرے سامان آرائش سے صرف سجا دیا جانا چاہیئے، اس میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں ہے کہ کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم کیا جائے،

چھت سے شروع کریں یا دیوار سے، دیوار کے اوپری حصہ سے یا نچلے حصہ سے ؛ جبکہ اس کے برعکس عرفان میں : اخلاقی عناصر کو متحرک شکل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

ثالثاً : اخلاق کے روحی عناصر صرف ان ہی معانی و مفاہیم تک محدود ہیں جنھیں عام طور سے پہچانتے ہیں جبکہ عرفان کے روحی عناصر اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں ۔

عرفانی سیر و سلوک میں کچھ قلبی واردات واحوال کا تذکرہ ہوتا ہے جو مجاہدات اور سفر کے دوران صرف " سالکِ راہ " پر طاری ہوتے ہیں ۔ دوسرے افراد ان احوال و واردات سے بے بہرہ ہیں ۔

عرفان کا ایک دوسرا شعبہ تفسیر وجود یعنی خدا ، انسان اور کائنات کی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے اس شعبہ میں عرفان کی حیثیت ، فلسفہ جیسی ہے ۔ وہ وجود و ہستی کی تفسیر کرنا چاہتا ہے ۔ یہ اس پہلے شعبہ کے برخلاف ہے جو اخلاق کی طرح انسان کو بدلنا چاہتا ہے ۔ جس طرح پہلے شعبہ میں اور اخلاق میں فرق تھا اسی طرح اس دوسرے شعبہ اور فلسفہ میں بھی کچھ تفاوت پایا جاتا ہے جسے ہم آئندہ درس میں بیان کریں گے ۔

(۲)

نظری عرفان

اب عرفان کے دوسرے شعبہ یعنی نظری عرفان کے سلسلہ میں کچھ وضاحت ملاحظہ فرمائیں :

نظری عرفان وجود و ہستی کی تفسیر کرتا ہے ۔ خدا ، انسان اور کائنات کے بارے میں بحث کرتا ہے ۔

عرفان اس شعبہ میں الٰہی فلسفہ کے مانند ہے جو وجود و ہستی کی تفسیر و تشریح کرتا ہے ۔ جس طرح الٰہی فلسفہ اپنے موضوع ، مقدمات اور مسائل کا تعارف کراتا ہے ۔ عرفان بھی اپنے موضوع مسائل اور مقدمات کی وضاحت کرتا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فلسفہ اپنے استدلالوں میں صرف عقلی اصول و مبادی پر بھروسہ کرتا ہے جبکہ عرفان " کشفی " اصول و مبادی کو استدلال کی بنیاد قرار دیتا ہے اور پھر عقل کی زبان میں اس کی وضاحت کرتا ہے ۔

عقلی و فلسفی استدلالات ان مطالب کے مانند ہیں جنھیں اسی زبان میں پڑھا جائے جس میں

وہ تحریر کئے گئے ہیں لیکن عرفانی استدلالات کی مثال ان مطالب جیسی ہے جنھیں کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو، یعنی عارف نے جن چیزوں کا اپنے پورے وجود اور دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے کم از کم اپنے دعوے کے مطابق انھیں عقل کی زبان میں بیان کرتا ہے۔

عرفان وجود و ہستی کی جو تفسیر پیش کرتا ہے وہ فلسفہ کی پیش کردہ تفسیر سے نہایت عمیق فرق رکھتی ہے۔ عرفانی تصور کائنات اور فلسفی تصور کائنات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

الٰہی فلسفی کی نگاہ میں خدا بھی اصالت رکھتا ہے اور غیر خدا بھی ایک حقیقت ہے۔ فرق یہ ہے کہ خدا، واجب الوجود اور قائم بالذات ہے جبکہ غیر خدا، ممکن الوجود۔ قائم بالغیر اور واجب الوجود معلول ہے۔ لیکن عارف کی نظر میں غیر خدا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا خدا کے مقابلہ میں کوئی وجود ہو، وہ غیر خدا کے وجود کو اس کے معلول کی حیثیت سے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں خدا کا وجود تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، یعنی تمام چیزیں خداوند عالم ہی کے جلوے اور اس کے اسماء وصفات ہیں نہ کہ اس کے مقابلہ میں کوئی چیز۔

فلسفی اور عارف کے طرز فکر میں اختلاف ہے۔ فلسفی کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ کائنات کی ایک صحیح اور نسبتاً جامع و کامل تصویر اپنے ذہن میں مجسم کرے، فلسفی کی نگاہ میں انسان کا آخری کمال وارتقاء یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کے ذریعہ کائنات کو اسی طرح پہچان لے جیسی وہ ہے۔ یہاں تک کہ کائنات اس کے وجود میں، عقلی وجود اختیار کرلے اور وہ ایک عقلی کائنات بن جائے۔ اسی لئے فلسفہ کی تعریف میں کہا گیا ہے:۔

صیرورة الانسان عالماً عقلياً مضاهياً للعالم العيني۔

یعنی فلسفی اس انسان کو کہتے ہیں جو اس خارجی عالم و عینی کائنات کی طرح ایک عقلی کائنات بن جائے۔

لیکن عارف کو عقل و فہم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ عارف صرف، وجود و ہستی یعنی خدا کی کنہ و حقیقت تک پہنچنا، اس سے متصل ہونا اور اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

عارف کی نگاہ میں انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ذہن میں وجود و ہستی کی ایک تصویر اتار لے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ سیر و سلوک کے سہارے اس اصل کی طرف پلٹ جائے

جہاں سے وہ آیا ہے اور ذات حق سے اپنی دوری اور فاصلہ کو ختم کرے اور بساط تقرب میں خود کو فنا کر کے اس کے وجود میں باقی ہو جائے۔

فلسفی کا ہتھیار، عقل و منطق و استدلال ہے لیکن عارف کا اوزار، دل، مجاہدت، تصفیہ تہذیب اور باطن میں حرکت و اقدام ہے۔

آئندہ جب ہم عرفانی تصور کائنات کے بارے میں بحث کریں گے تو فلسفی تصور کائنات اور عرفانی تصور کائنات کے فرق کو بھی نمایاں کریں گے۔

عرفان اور اسلام

عرفان اپنے عملی و نظری دونوں شعبوں میں دینِ اسلام سے قربت رکھتا ہے، کیونکہ اسلام نے تمام ادیان و مذاہب کی طرح بلکہ ان سب سے زیادہ انسان کے، خدا، کائنات اور خود اپنے سے مربوط تعلقات کو بھی بیان کیا ہے اور وجود و ہستی کی تفسیر و تشریح بھی کی ہے۔

فطری طور پر یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ عرفان اور اسلام کی پیش کردہ تعلیمات کے درمیان کس قسم کی نسبت پائی جاتی ہے؟

جہاں تک اسلامی عرفا کا تعلق ہے وہ ہرگز یہ نہیں مانتے کہ ان کی کوئی بات اسلام سے جدا ہے اور اس قسم کے الزام سے بڑی شدت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی حقائق کو سب سے بہتر ان ہی لوگوں نے کشف کیا ہے اور سچے مسلمان صرف وہی لوگ ہیں۔ عرفا نے عرفان کے عملی و نظری دونوں شعبوں میں ہمیشہ قرآن و سنت، پیغمبرؐ اور ائمہؑ کی سیرت نیز بزرگ صحابہ کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دیا ہے۔

لیکن دوسرے لوگ ان کے بارے میں کچھ اور ہی رائے رکھتے ہیں، جنھیں ہم ترتیب وار بیان کر رہے ہیں:۔

الف۔ بعض اسلامی فقہا و محدثین کا نظریہ۔ ان لوگوں کے خیال میں، عرفا عملی طور پر اسلام کے پابند نہیں ہیں، کتاب و سنت سے ان کا تمسک، صرف عوام کو فریب دینے اور مسلمانوں کے دلوں کو اپنی جانب کھینچنے کی غرض سے ہے اور بنیادی طور پر عرفان، اسلام سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتا۔

ب ۔ عصر حاضر کے بعض ترقی پسندوں کا نظریہ ۔ یہ گروہ بھی، جو اسلام کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا جس چیز سے بھی "اباحیت" کی بُو آتی ہو اور اس سے اسلام و اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک تحریک کے طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہو اسے بڑی گرمجوشی سے گلے لگاتا ہے ، یہ پہلے گروہ (الف) کی طرح ، خیال کرتا ہے کہ عرفا عملاً اسلام پر ایمان نہیں رکھتے ، بلکہ عرفان و تصوف معنویت کی آڑ میں اسلام اور عربوں کے خلاف غیر عرب قوموں کی ایک تحریک تھی ،

یہ دونوں گروہ ، عرفان کے اسلام مخالف ہونے پر متفق ہیں ، ان کے درمیان بس اختلاف یہ ہے کہ پہلا گروہ اسلام کا احترام کرتا ہے اور مسلم عوام کے اسلامی جذبات کے سہارے ، عرفا کی تحقیر کرتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ۔ اور یہی حربہ استعمال کر کے عرفا کو اسلامی معارف کے میدان سے دور کرنا چاہتا ہے ۔ جبکہ دوسرا گروہ ، عرفا ۔ جن میں سے بعض عالمی شہرت کے حامل ہیں ۔ کی شخصیت کے سہارے اسلام کے برخلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کا کا ایک حربہ فراہم کرنا اور یہ مشہور کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی ثقافت میں پائے جانے والے اعلیٰ اور لطیف عرفانی افکار ، اسلام سے بیگانہ ہیں اور یہ عناصر باہر سے ، اس ثقافت میں داخل ہوئے ہیں ۔ اسلام اور اسلامی افکار کی سطح اس قسم کے افکار سے کہیں پست ہے ۔ اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ عرفا نے کتاب و سنت سے تمسک صرف عوام کے خوف سے اور تقیہ کے طور پر کیا ہے ، وہ اس طرح اپنی جان کی حفاظت کرنا چاہتے تھے ۔

ج ۔ بعض غیر جانبداروں کا نظریہ ۔ اس گروہ کے نقطہ نظر سے عرفان و تصوف خاص طور سے عملی عرفان میں اور بالاخص جہاں عرفان ایک فرقہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے بہت سے ایسے انحرافات اور بدعتیں نظر آتی ہیں جو قرآن اور معتبر حدیثوں سے میل نہیں کھاتیں لیکن خود عرفا ، تمام اسلامی ثقافتی طبقات اور اکثر اسلامی فرقوں کی طرح ، اسلام کے تئیں خلوص رکھتے تھے اور وہ اسلام کے خلاف کوئی بات ہرگز نہیں کہنا چاہتے تھے ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ لغزشوں کے شکار ہوئے ہوں ، جس طرح دوسرے ثقافتی طبقات مثلاً ، متکلمین ، فلاسفہ ، مفسرین اور فقہا و بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن وہ اسلام کے تئیں بُری نیت ہرگز نہیں رکھتے تھے ۔

عرفا کے اسلام مخالف ہونے کا مسئلہ جن لوگوں نے اٹھایا ہے، وہ یا اسلام سے کدورت رکھتے تھے اور یا عرفان سے اگر کوئی شخص غیر جانب دار ہو کر عرفا کی کتابوں کا مطالبہ کرے۔ بشرطیکہ ان کی زبان اور ان کے اصطلاحات سے بھی واقف ہو ___ تو ممکن ہے اسے بہت سے اشتباہات نظر آئیں لیکن وہ اسلام کے تئیں عرفا کے اخلاص وایقان میں ہرگز شک نہیں کرے گا۔

ہم تیسرے نظریہ کو ترجیح دیتے ہوئے عقیدہ رکھتے ہیں کہ عرفا، بری نیت نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ عرفان اور اسلام کے عمیق معارف میں مہارت رکھنے والے کچھ افراد پوری جانبداری کے ساتھ عرفانی مسائل اور اسلام سے اس کے انطباق کے بارے میں بحث و تحقیق کریں۔

شریعت، طریقت، حقیقت

عرفا و غیر عرفا، خصوصاً فقہا، کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ، شریعت، طریقت اور حقیقت کے بارے میں عرفا کا مخصوص نظریہ ہے۔

عرفا و فقہا دونوں ہی اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت یعنی اسلامی احکام و قوانین کچھ حقیقتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہیں۔ عام طور سے فقہا "مصلحتوں" سے ان چیزوں کو مراد لیتے ہیں جو انسان کو سعادت یعنی مادی و معنوی نعمتوں سے استفادہ کی حد اعلیٰ تک پہنچاتی ہیں۔ لیکن عرفا کہتے ہیں، تمام راستے خدا ہی کی جانب جاتے ہیں اور تمام مصالح و حقائق ان شرائط، امکانات، وسائل اور مقتضیات کے مانند ہیں جو انسان کو خدا کی جانب لے جاتے ہیں۔

فقہا صرف اتنا کہتے ہیں کہ شریعت (احکام و قوانین) کے پس پشت کچھ مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور وہ مصلحتیں، شریعت کی روح اور علت شمار ہوتی ہیں، ان مصلحتوں تک رسائی کا واحد ذریعہ شریعت پر عمل ہے، جبکہ عرفا کا عقیدہ ہے کہ شریعت میں پوشیدہ مصلحتیں اور حقیقتیں ان منزلوں اور مرحلوں کے مانند ہیں جو انسان کو تقرب الٰہی اور وصال حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔

عرفا کا عقیدہ ہے کہ شریعت کا باطن "راستہ" ہے جسے وہ "طریقت" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس راستہ کی انتہا "حقیقت" ہے یعنی توحید، ان معنوں میں جن کی طرف پہلے اشارہ

کیا جا چکا کہ وہ عارف کے اپنی ذات اور اپنی انانیت سے دستبردار ہو جانے کے بعد رونما ہوتی ہے۔
اسی لئے عارف تین چیزوں پر ایمان رکھتا ہے: شریعت، طریقت، حقیقت۔ اس کا نظریہ ہے کہ شریعت، طریقت کے لئے ایک وسیلہ ہے اور طریقت حقیقت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اسلام کے بارے میں فقہاء کا نظریہ وہی ہے جیسے ہم کلام سے مربوط دروس میں بیان کر چکے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اسلامی احکام و قوانین تین شعبوں میں بٹے ہوئے ہیں: پہلا شعبہ اعتقادی اصول سے مربوط ہے جس کا ذمہ دار علم کلام ہے۔

اعتقادی اصول کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ انسان ان پر عقل کے ذریعہ ناقابل تزلزل پختہ ایمان رکھتا ہو۔

دوسرا شعبہ اخلاق ہے، اس شعبہ میں کچھ ایسے احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں جو اخلاقی فضائل و رذائل کے لحاظ سے انسان کے فرائض معین کرتے ہیں اور اس کا ذمہ دار علم اخلاق ہے

تیسرا شعبہ، احکام کا شعبہ ہے جو انسان کے افعال و اعمال سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی ذمہ دار فقہ ہے۔

یہ تینوں شعبے ایک دوسرے سے جدا ہیں، عقائد کا شعبہ عقل و فکر سے تعلق رکھتا ہے اخلاق کا شعبہ نفس اور نفسانی عادات و ملکات سے مربوط ہے اور احکام کا شعبہ اعضاء و جوارح سے ربط رکھتا ہے۔

لیکن عرفا عقائد کے شعبہ میں، صرف ذہنی و عقلی اعتقاد کو کافی نہیں سمجھتے ان کا دعویٰ ہے کہ جن چیزوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے ان تک وصول و رسائی بھی ضروری ہے۔ انسان کو ایسا کام کرنا چاہیئے کہ اس کے ان حقائق کے درمیان حائل پردے اٹھ جائیں۔ دوسرے شعبہ میں جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اخلاق ساکن بھی ہے اور محدود بھی ــــ وہ اخلاق کو کافی نہیں سمجھتے، وہ علمی و فلسفی اخلاق کے بجائے عرفانی سیر و سلوک کو پیش کرتے ہیں۔

تیسرے شعبہ میں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صرف کچھ خاص مقامات پر انھوں نے بعض باتیں کہی ہیں جنھیں ممکن ہے فقہی احکام کے خلاف تصور کیا جائے۔

عرفان تینوں شعبوں کو شریعت، طریقت، حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں اور عقیدہ رکھتے

ہیں کہ جس طرح خود انسان، واقعی طور پر، تین حصوں میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ یعنی جسم، نفس اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے متحد ہیں اور ان کی آپسی نسبت، ظاہر و باطن کی نسبت ہے، شریعت، طریقت اور حقیقت بھی ایسی ہی ہیں یعنی ایک ظاہر ہے دوسری باطن اور تیسری باطن کی باطن۔ بس فرق اتنا ہے کہ عرفا انسانی وجود کے مراتب کو تین مراحل سے زیادہ جانتے ہیں۔ یعنی وہ عقل سے ماوراء مراحل و مراتب کے بھی قائل ہیں جن کے بارے میں انشاء اللہ بعد میں توضیح دی جائے گی۔

۳

اسلامی عرفان کا سرمایہ

کسی بھی علم سے واقف ہونے کے لئے اس علم کی تاریخ اس کے تغیرات، اور ان شخصیتوں سے واقفیت ضروری ہے جو اس علم کے حامل، وارث یا اس کے موجد ہیں۔ اسی طرح اس علم کی بنیادی کتابوں سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ ہم موجودہ اور چوتھے درس میں ان ہی مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔

پہلا مسئلہ جو یہاں بیان ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آیا اسلامی عرفان، علم فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث کے مانند ہے؟ یعنی یہ ان علوم میں سے ہے جن کا اصل سرمایہ اور جوہر مسلمانوں نے اسلام سے حاصل کیا ہے اور ان کے لئے اصول و قواعد کشف کئے ہیں؟ یا یہ طب و ریاضیات کے مانند ہے جس نے باہر سے اسلامی دنیا میں قدم رکھا ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے دامن میں مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے اور یا کوئی تیسری صورت حال بھی ہے؟

عرفا خود پہلی شق، اختیار کرتے ہیں اور کسی دوسری شق کو انتخاب کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہیں بعض مستشرقین کا اصرار تھا اور ہے کہ عرفان اور اس کے دقیق و لطیف افکار، سب کے سب باہر سے اسلامی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ کبھی اس کے لئے عیسائی جڑیں تلاش کرتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ یہ عارفانہ افکار، عیسائی راہبوں سے مسلمانوں کے ارتباط کا نتیجہ ہیں۔ کبھی اسے اسلام و عرب کے خلاف ایرانیوں کا رد عمل قرار دیتے ہیں۔ کبھی اسے سو فیصد جدید افلاطونی فلاسفہ کی پیداوار بتاتے ہیں جو خود ارسطو، افلاطون، فیثا غورس، اسکندریہ کے غنوسیوں اور یہود و نصاریٰ کے افکار و عقائد کا مجموعہ ہے۔ اور کبھی اسے بودائی نظریات کی دین قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح خود اسلامی دنیا میں بھی عرفا کے مخالفین، عرفان و تصوف کو سرے سے اسلام سے بیگانہ اور اس کی بنیادوں کو غیر اسلامی ثابت کرنے کے کوشاں رہے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عرفان نے عملی و نظری دونوں شعبوں میں اپنا ابتدائی سرمایہ خود اسلام سے حاصل کیا ہے اور اس سرمایہ کے کچھ اصول و ضوابط وضع کئے ہیں۔ باہر کے حالات خاص طور سے کلامی و فلسفی افکار اور خصوصیت سے اشراقی فلسفہ کے افکار و نظریات سے بھی متاثر ہوا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ عرفا، ابتدائی اسلامی سرمایہ کے لئے صحیح اصول و ضوابط بیان کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور آیا اس سمت میں ان کی کامیابی، فقہا کے برابر ہے یا نہیں؟ وہ اسلامی کے واقعی اصول سے منحرف نہ ہونے کے کس قدر پابند تھے؟ اسی طرح بیرونی افکار اسلامی عرفان پر کس قدر اثر انداز ہوئے ہیں؟ آیا اسلامی عرفان نے انھیں اپنے اندر جذب کیا ہے، ان پر اپنا رنگ چڑھایا ہے اور اپنے مقاصد کے لئے ان سے استفادہ کیا ہے یا اس کے برعکس ان افکار نے اسلامی عرفان کو خود اپنے راستہ پر ڈال دیا ہے۔

یہ وہ مسائل و مطالب ہیں جن کے بارے میں الگ الگ بحث و گفتگو ضروری ہے البتہ اتنا یقینی ہے کہ اسلامی عرفان نے اپنا اصلی سرمایہ اسلام ہی سے لیا ہے۔

پہلے نظریہ کے طرفدار ـــ اور ایک حد تک دوسرے نظریہ کے حامی بھی ـــ مدعی ہیں کہ اسلام پیچیدہ، مشکل سے سمجھ میں آنے والے یا سرے سے سمجھ میں نہ آنے والے مفاہیم اور ہر قسم کے اسرار و رموز سے خالی نیز عام فہم، بے تکلف اور سہل و سادہ دین ہے۔

اسلام کی اعتقادی بنیاد توحید ہے۔ اسلام کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھر کا ایک بنانے والا ہوتا ہے جو اس سے جدا اور الگ ہوتا ہے اسی طرح کائنات کا بھی ایک بنانے والا

ہے جو اس سے جدا و علیحدہ ہے۔ اسلام کی نظر میں متاع دنیا سے انسان کے رابطہ کی بنیاد زہد ہے۔

زہد سے مراد، آخرت کی دائمی و جاوید نعمتوں کے حصول کے لئے دنیا کی فانی متاع سے چشم پوشی ہے اس کے علاوہ کچھ آسان عملی احکام ہیں جنھیں فقہ بیان کرتی ہے۔

اس گروہ کے نقطہ نظر سے، عرفا نے توحید کے نام پر جو کچھ پیش کیا ہے وہ اسلامی توحید سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں۔ کیونکہ عرفانی توحید کا مطلب، وحدت وجود اور یہ کہ اس کائنات میں خدا، اس کے اسمار، اس کے صفات اور اس کے تجلیات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

عرفانی سیر و سلوک بھی اسلامی زہد سے پرے ہے، کیونکہ سیر و سلوک میں عشق و محبتِ خدا، فنا فی اللہ اور قلب عارف پر تجلی خدا جیسے معانی و مفاہیم بیان ہوتے ہیں جو اسلامی زہد میں نظر نہیں آتے۔

عرفانی طریقت بھی، اسلامی شریعت سے کوسوں دور ہے۔ کیونکہ آداب طریقت میں ایسے ایسے مسائل پائے جاتے ہیں جن سے فقہ بے خبر ہے۔

اس گروہ کی نظر میں رسول اکرم کے وہ اصحاب اخیار جن سے عرفا و صوفیا اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور انھیں اپنا پیشرو بتاتے ہیں وہ زاہد کے سوا کچھ اور نہ تھے۔ عرفانی سیر و سلوک اور عرفانی توحید سے ان کی روح بھی باخبر نہیں تھی، وہ متاع دنیا سے منھ موڑ کر عالم آخرت سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ان کی روح پر حاکم اصول، خوف و رجا تھا، عذاب جہنم کا خوف اور بہشتی ثوابوں کی امید۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کے نظریہ کو کسی بھی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا ابتدائی سرمایہ اس سے کہیں زیادہ مالا مال ہے جیسے اس گروہ نے جہالتاً یا عمداً فرض کیا ہے نہ اسلامی توحید اتنی آسان اور کھوکھلی ہے جیسا ان لوگوں نے فرض کیا ہے، نہ ہی اسلام میں انسان کی معنویت، زہد خشک میں منحصر ہے نہ ہی رسول اکرمؐ کے اصحاب اخیار ایسے تھے جیسا ان لوگوں نے بیان کیا اور نہ ہی اسلامی آداب، اعضاء و جوارح سے انجام پانے والے اعمال، میں محدود و مقید ہیں

ہم اس درس میں، اجمالی طور پر کچھ ایسے مطالب بیان کریں گے جن سے یہ واضح ہو سکے کہ

اسلام کے اصلی تعلیمات میں ، نظری و عملی عرفان کو کچھ عمیق معارف عطا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اب رہی یہ بات کہ اسلامی عرفا نے ان تعلیمات سے کس قدر صحیح فائدہ اٹھایا ہے اور کس حد تک بھٹکے ہیں یہ ایسے مطالب ہیں جنھیں ان مختصر بحثوں میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔

قرآن کریم ، توحید کے موضوع میں ، تخلیق اور خدا کو گھر اور گھر کے بنانے والے پر ہرگز قیاس نہیں کرتا ، قرآن ، خدا کو کائنات کا خالق و موجد بتاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی مقدس ذات ہر جگہ اور ہر چیز کے ہمراہ ہے۔

" ایـنـمـا تـولـوا فـثـم وجـه اللہ " جس طرف رخ کرو وہاں خدا کا چہرہ موجود ہے۔

ونحن اقرب الیکم منکم " ہم تم سے خود تمہاری ذات سے زیادہ قریب ہیں۔

" هو الاول والآخر والظاهر والباطن ، وہ تمام اشیاء کا اول ہے اور وہی تمام اشیاء کا آخر ہے (اسی سے ان کا آغاز ہوا ہے اور اسی پر ان کا انجام ہوگا) وہ ظاہر و آشکار ہے اور وہی باطن و مخفی بھی ہے۔ اور اسی طرح کی بہت سی آیتیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی آیتیں ، افکار و خیالات کو عوام کی توحید سے بالاتر توحید کی طرف متوجہ کرتی ہیں چنانچہ اصول کافی میں ہے کہ خدا جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں ، توحید کے بارے میں غور و فکر کرنے والے افراد پیدا ہوں گے اسی لئے اس نے سورۂ قل ہو اللہ احد اور سورہ حدید کی ابتدائی آیتیں نازل فرمائیں۔

سیر و سلوک ، اور تقرب الٰہی آخری منزلوں کو طے کرنے کے سلسلہ میں ، " لقاء اللہ " ، " رضوان اللہ " اور وحی و الہام نیز انبیاء کے علاوہ دیگر افراد ___ مثلاً حضرت مریم ___ سے ملائکہ کی گفتگو اور خاص طور سے معراج رسول اکرمؐ سے مربوط آیتوں کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

قرآن کریم میں نفس امارہ ، نفس لوامہ ، نفس مطمئنہ کا تذکرہ ہے ، " علم افاضی " و " علم لدنی " اور مجاہدہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی ہدایتوں کا ذکر ہے : والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا قرآن میں تزکیہ نفس کو فلاح و کامیابی کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے : قد افلح من زکیها و قد خاب من دسیها۔

قرآن میں بار بار ، حب الٰہی کو تمام انسانی محبتوں اور تعلقات سے بالاتر قرار دیا گیا ہے

قرآن نے کائنات کے ذرہ ذرہ کی تسبیح و تحمید کی تصویر کشی کی ہے اوران کی ایسی تعبیر کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنے "تفقہ" کو مکمل کرے تو ان کی تسبیح و تحمید کو درک کر سکتا ہے اس کے علاوہ قرآن نے انسان کی سرشت کے سلسلہ میں "نفخۂ الٰہی" کا مسئلہ بھی پیش کیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل، خدا، کائنات، انسان اور خاص طور سے خدا وانسان کے تعلقات کے بارے میں ایک عظیم معنوی افکار کا سلسلہ وجود میں لانے کے لئے کافی تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ مسلم عرفا نے ان سرمایوں سے کس طرح استفادہ کیا ہے۔ صحیح یا غلط؟ ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کا عظیم سرمایہ، اسلامی دنیا کو بہترین الہام بخش سکتا ہے۔ بالفرض اگر عرفا کے نام سے مشہور افراد اس سرمایہ سے صحیح فائدہ نہ بھی اٹھا سکے ہوں تو کچھ دوسرے افراد نے جو اس نام سے مشہور نہیں ہیں اس سے صحیح فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کے علاوہ روایتوں، خطبوں، دعاؤں، اسلامی استدلالات، اسلام کے دامن میں پروان چڑھنے والی عظیم شخصیتوں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ صدر اسلام میں صرف اجر و ثواب کے امید میں عبادت اور خشک زہد ہی نہیں تھا۔

ان روایتوں، خطبوں، دعاؤں اور استدلالوں میں بہت ہی عظیم مفاہیم بیان ہوئے ہیں صدر اسلام کی شخصیتوں کے حالات، روحانی واردات قلبی بصیرتوں، سوز و گداز اور معنوی عشق کے ایک سلسلہ کی حکایت کرتے ہیں۔ بطور نمونہ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

اصول کافی میں ہے کہ: ایک دن نماز صبح کے بعد رسول خدا ؐ کی نظر ایک جوان پر پڑی جس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور جسم اتنا نحیف و زار ہو چکا تھا کہ اسے اپنا توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ حضرت نے اس سے دریافت فرمایا کیف اصبحت؟ کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا: "اصبحتُ موقناً" یقین کی حالت میں بسر کر رہا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: تیرے یقین کی علامت کیا ہے؟

عرض کیا: یہ میرا یقین ہی ہے جس نے مجھے رنج و اندوہ میں غرق کر کے میری شبوں

کو بیدار اور دنوں کو پیاسا بنا دیا ہے (یعنی رات بھر عبادت کرتا ہوں اور دن بھر روزہ رکھتا ہوں) اور مجھے دنیا و مافیہا سے بیگانہ بنا دیا ہے یہاں تک کہ گویا میں عرش پروردگار کا مشاہدہ کر رہا ہوں جسے لوگوں کا حساب کتاب لینے کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ سب لوگ میدان حشر میں اکٹھا ہیں اور میں بھی ان کے درمیان ہوں، گویا میں اہل بہشت کو جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہوتے اور جہنمیوں کو جہنم کی آگ میں جلتے دیکھ رہا ہوں گویا ابھی اسی وقت ان ہی کانوں سے آتش جہنم کی حرکت کی آواز سن رہا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: یہ وہ بندہ ہے جس کے دل کو خدا نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے، اس کے بعد اس جوان سے آپ نے فرمایا: اپنی اس کیفیت کی حفاظت کرو کہ کہیں یہ تم سے چھن نہ جائے۔

جوان نے عرض کیا: دعا فرمایئے خدا مجھے شہادت نصیب فرمائے۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک جنگ پیش آئی اور یہ جوان اس جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہو گیا۔

رسول اکرمؐ کی زندگی، حالات، ارشادات اور مناجاتیں معنوی و الٰہی احساسات و جذبات سے سرشار اور عرفانی اشاروں سے لبریز ہیں۔ عرفا نے رسول اکرمؐ کی دعاؤں سے بے حد استفادہ کیا ہے اور انھیں اپنے مدعا کی دلیل قرار دیا ہے۔

تقریباً سبھی عرفا و صوفیا اپنے سلسلہ کو امیر المومنین علی علیہ السلام تک پہنچاتے ہیں آپؑ کے ارشادات، معنویت و معرفت کا بیش بہا خزانہ ہیں، ہم یہاں نہج البلاغہ میں مذکور دو عبارتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:۔

خطبہ ۲۲۰ میں حضرت فرماتے ہیں:۔

"ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اجعل الذکر جلاء للقلوب تسمع بہ بعد الوقرۃ وتبصر بہ بعد العشوۃ وتنقاد بہ بعد المعاندۃ ومابرح للہ عزت آلاؤہ فی البرھۃ بعد البرھۃ وفی ازمان الفترات عباد ناجاھم فی فکرھم وکلمھم فی ذات عقولھم۔"

بے شک اللہ سبحانہ نے اپنی یاد کو دلوں کی صیقل قرار دیا ہے جس کے ذریعہ وہ بہرا ہونے کے بعد سننے لگے اور اندھے پن کے بعد دیکھنے لگے اور دشمنی وعناد کے بعد فرمانبردار ہو گئے یکے بعد دیگرے ہر عہد اور انبیاء سے خالی دور میں حضرت رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ موجود رہے ہیں جن کی فکروں میں سرگوشیوں کی صورت میں گفتگو کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے بات کرتا ہے۔

خطبہ ۲۲۰ میں اللہ والوں کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"قَدْ اَحْیٰی عَقْلَهٗ وَ اَمَاتَ نَفْسَهٗ حَتّٰی دَقَّ جَلِیْلُهٗ وَلَطُفَ غَلِیْظُهٗ وَ بَرَقَ لَهٗ لَامِعٌ کَثِیْرُ الْبَرْقِ فَاَبَانَ لَهُ الطَّرِیْقَ وَ سَلَکَ بِهِ السَّبِیْلَ وَ تَدَافَعَتْهُ الْاَبْوَابُ اِلٰی بَابِ السَّلَامَةِ وَ دَارِ الْاِقَامَةِ وَثَبَتَتْ رِجْلَاهُ بِطُمَاْنِیْنَةِ بَدَنِهٖ فِیْ قَرَارِ الْاَمْنِ وَالرَّاحَةِ بِمَا اسْتَعْمَلَ قَلْبَهٗ وَاَرْضٰی رَبَّهٗ"

مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہو گیا ہے اس کے لئے بھرپور درخشندگیوں والا انور ہدایت چمکا جس نے اس کے سامنے راستہ نمایاں کر دیا اور اسے سیدھی ہی راہ پر لے چلا اور مختلف دروازے اسے ڈھکیلتے ہوئے سلامتی کے دروازہ اور قرارگاہ تک لے گئے اور اس کے پاؤں بدن کے ٹکاؤ کے ساتھ امن و راحت کے مقام پر جم گئے چونکہ اس نے اپنے دل کو عمل میں لگائے رکھا تھا اور اپنے پروردگار کو راضی و خوشنود کیا تھا۔

اسلامی دعائیں خاص طور سے شیعہ دعائیں معارف کا ایک خزانہ ہیں، دعاء کمیل، دعاء ابو حمزہ مناجات شعبانیہ اور صحیفہ سجادیہ کی دعائیں ان کا بہترین نمونہ ہیں۔ اعلیٰ ترین معنوی افکار ان ہی دعاؤں میں ہیں۔ اتنے سارے مصادر و مآخذ کے ہوتے ہوئے۔ کیا کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم اس کے لئے بیرونی مصدر و ماخذ کی جستجو کریں؟ ہمیں یہی منظر ابوذر غفاری کی اس معاشرتی و تنقیدی تحریک میں بھی نظر آتا ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ کے ستمگروں کے خلاف چلائی تھی

حضرت ابوذر کو اپنے زمانہ میں ہونے والے ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور بے جا امتیازات پر سخت اعتراض تھا جس کی پاداش میں انھیں جلا وطنی اور طرح طرح کی جان فرسا اذیتیں برداشت کرنی پڑیں اور آخر کار تنہائی و جلا وطنی ہی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

اب بعض مستشرقین یہ سوال کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر کے اس اقدام کا محرک کیا تھا؟ یہ لوگ حضرت ابوذر کی اس تحریک کا محرک و عامل اسلامی دنیا سے باہر تلاش کرنے کی کوشش میں ہیں

جارج جرداق، عیسائی مصنف اپنی کتاب "**الامام علی صوت العدالة الانسانیۃ**" میں لکھتا ہے: ان افراد پر تعجب ہے، یہ تو بالکل یوں ہی ہے کہ کسی شخص کو دریا کے کنارے دیکھیں اور پھر یہ غور کریں کہ اس شخص نے اپنا برتن کس گڑھے یا حوض سے بھرا ہے اس کے بھرے ہوئے برتن کی توجیہ کرنے کے لئے گڑھے کی تلاش میں سرگرداں رہیں لیکن اس سمندر یا دریا کو نظر انداز کر دیں۔

ابوذر، اسلام کے سوا کس چشمہ سے سیراب ہو سکتے تھے، اسلام کے سوا کون سا مصدر ابوذر کو معاویہ جیسے ظالموں کے مقابلہ میں اقدام کرنے کے لئے الہام بخش سکتا تھا؟

آج بعینہ یہی صورت حال، عرفان کے سلسلہ میں نظر آتی ہے، مستشرقین اس عظیم اسلامی سمندر کو بھلا کر اس کے لئے اسلام کے سوا کوئی دوسرا سرچشمہ تلاش کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو عرفانی معنویتوں کو الہام عطا کر سکے

کیا چند مستشرقوں، اور ان کے مشرقی پیرؤوں کے مفروضہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن، حدیث، استدلال، دعا، خطبہ اور سیرت پر مشتمل اس عظیم سرچشمہ سے انکار کیا جا سکتا ہے؟!

ابتداء میں مستشرقوں کو اصرار تھا کہ اسلامی عرفان کا سرچشمہ، اسلام کے اصلی تعلیمات کے سوا کسی اور چیز کو قرار دیں، لیکن اب آج کل برطانیہ کے "نیکولسن" اور فرانس کے "ماسینیون" نے ـــــ جو اسلامی عرفان کے سلسلہ میں بڑا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلام سے بھی نا آشنا نہیں ہیں ـــــ صریحاً اعتراف کیا ہے کہ اسلامی عرفان کا اصل سرچشمہ قرآن و سنت ہے۔

میں یہاں نیکلسن کے چند جملے نقل کر کے اس درس کو ختم کر رہا ہوں، وہ کہتا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن فرماتا ہے " خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۱)، وہ اول و آخر ہے (۲)، اس کے سوا کوئی خدا نہیں (۳)، اس کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی (۴)، میں نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے (۵)، ہم نے انسان کو خلق کیا ہے اور جانتے ہیں کہ اس کی روح اس سے کیا کہتی ہے کیونکہ ہم اس سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (۶) جس طرف رخ کرو خدا وہیں ہے (۷)۔ خدا جسے نور نہ دے وہ نور سے محروم ہے (۸)"۔ یقیناً تصوف کی جڑیں ان ہی آیتوں میں پوشیدہ ہیں، اور ابتدائی صوفیوں کی نگاہ میں قرآن صرف کلمات خدا کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ خدا سے تقرب کا وسیلہ بھی تھا۔ عبادات اور قرآن کی مختلف آیتوں خاص طور سے "معراج" سے مربوط پراسرار آیتوں میں غور و فکر کے ذریعہ صوفیا اپنے اندر پیغمبرؐ کی صوفیانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۹) وہ کہتا ہے :-

"تصوف میں وحدت کا اصول، ہر جگہ سے زیادہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح پیغمبرؐ کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے : "اگر میرا بندہ، عبادت اور نیک اعمال کے نتیجہ میں مجھ سے نزدیک ہو جائے تو میں اسے دوست رکھوں گا، نتیجتاً میں اس کا کان ہوں اس طرح کہ وہ میرے ذریعہ سے سنتا ہے، میں اس کی آنکھ ہوں اس طرح کہ وہ میرے وسیلہ سے دیکھتا ہے

۱۔ اللہ نور السمٰوات والارض۔ سورہ نور / ۳۵

۲۔ ھو الاول والآخر۔ سورۂ حدید / ۳

۳۔ لا الٰہ الا ھو۔ سورۂ غافر / ۲

۴۔ کل من علیھا فان۔ سورہ رحمٰن / ۲۶

۵۔ ونفخت فیہ من روحی۔ سورہ الحجر / ۲۹

۶۔ ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید سورہ ق / ۱۶

۷۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ سورہ بقرہ / ۱۱۵

۸۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔ سورہ نور / ۴۰

۹۔ میراث اسلام ص ۸۴۔

میں اس کی زبان اور ہاتھ ہوں اس طرح کہ وہ میرے ذریعہ سے بولتا ہے اور پکڑتا ہے۔ (۱)

جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ آیا عرفا و صوفیا صحیح سمجھ سکے ہیں یا نہیں؟ ہماری بحث صرف یہ ہے کہ عرفان کے ان افکار کا سرچشمہ اسلامی متون ہیں یا باہر کی کوئی دوسری چیز؟ ۔

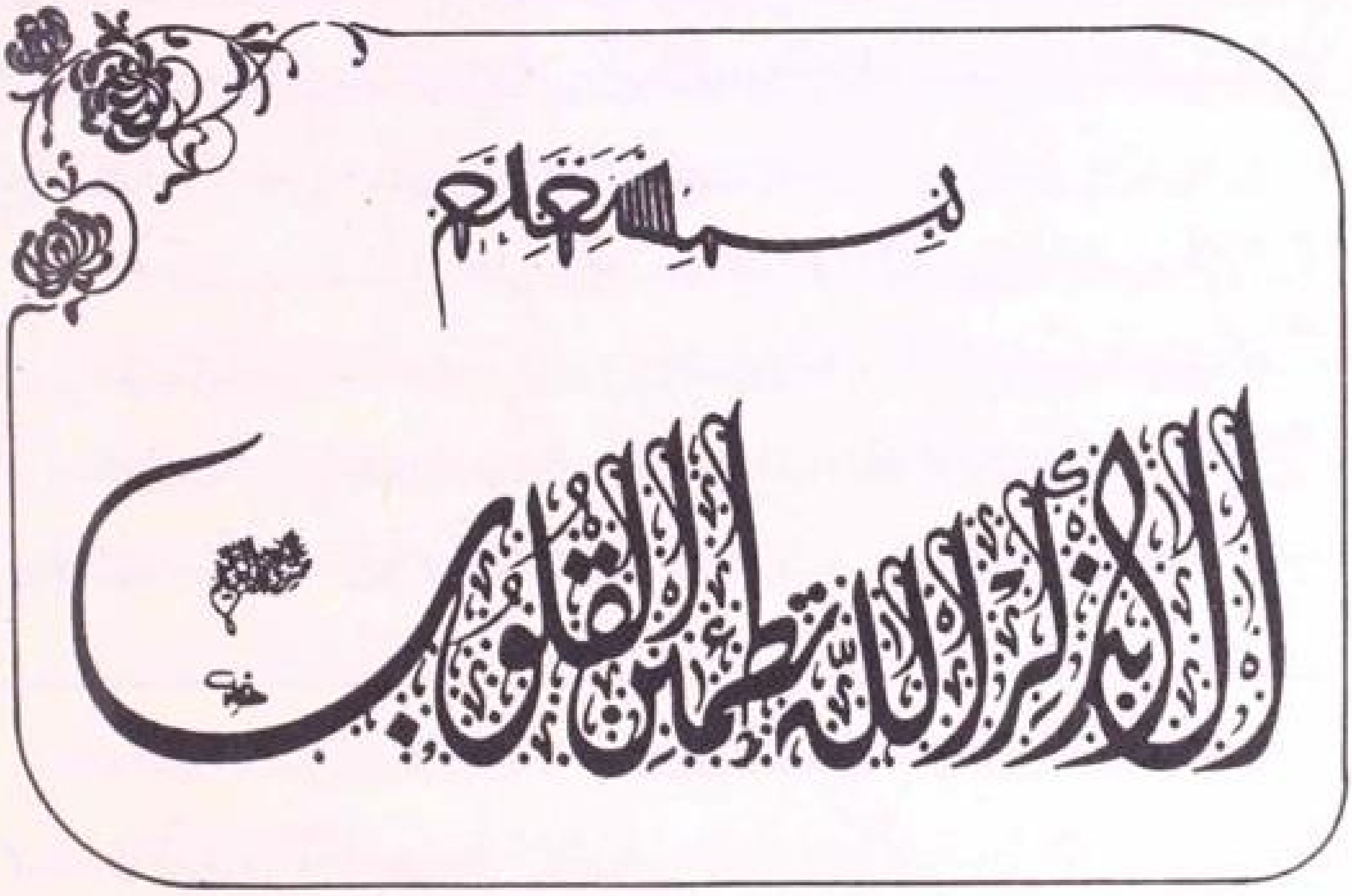

۱۔ یہ اس حدیث قدسی کا ترجمہ ہے: لایزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی اذا احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ولسانه الذی ینطق به ویده الذی یبطش بها۔

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

معارف اسلامی

قرآن میں انبیاء کرام کے معنوی جلوے

اس بحث کے دوران ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن انبیاء الٰہی کا تعارف کس طرح کراتا ہے اور ان کے لئے کن صفات و خصوصیات کا ذکر کرتا ہے اس بحث سے ہم اجمالی طور سے تین نتیجے اخذ کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن ہمیں انبیاء کرام کے سلسلہ میں ہر طرح کی افراط و تفریط سے روکتا ہے۔ یعنی جب ہم قرآن کے تعارف کی نوعیت و کیفیت کو سمجھ لیں گے تو پھر ان کے بارے میں حد سے آگے نہیں بڑھیں گے پیغمبروں کے لئے خدائی پہلوؤں کے قائل نہ ہوں گے نہ انھیں خدا کی طرف رشتہ کی شکل میں منسوب کریں گے اور نہ ہی خدا کی طرح ان کے اختیار مطلق، امور عالم میں ان کی کارفرمائی، رزق کی تقسیم اور ان کے قاضی الحاجات ہونے کے قائل ہوں گے۔

۲۔ اسی طرح ہم انبیاء کرام کے فضل و شرف اور ان پر اعتماد و یقین کی نوعیت کو سمجھ لیں گے تاکہ ہمارے لئے ان کے اخلاق اور کردار و فضائل اسوہ اور نمونہ عمل بن جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جان جائیں کہ یہ انبیاء جو خلق کے رہبر تھے، کون تھے اور کیا چاہتے تھے؟ اور ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے اور دوست دار کیسے ہیں اور اپنے رہبر سے کس حد تک فاصلہ رکھتے ہیں؟

۳۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے سلسلہ میں الٰہی انتخاب بلا سوچے سمجھے

نہیں تھا ۔ اور اگر خداوند عالم نے ان کو لوگوں کی رہبری و ہدایت کے لئے چنا ہے تو یہ افراد بھی اعلیٰ و بہترین انسانی و معنوی صفات و فضائل سے آراستہ رہے ہیں ۔ انبیاء کرام سے مربوط قرآنی آیات کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تقریباً چالیس صفات و فضائل بیان کئے گئے ہیں ۔ جن کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں

عبد

یعنی بندہ ۔ ایسا شخص جو پورے طور سے خود کو خدا کے اختیار میں سمجھتا ہے اور اسی کے احکام کی پیروی کرتا ہے خود اپنے لئے کوئی اختیار یا کسی مطلق ارادہ کا قائل نہیں ہے اور اپنی ذات میں کسی خدائی پہلو کا اظہار نہیں کرتا ۔ یہ لفظ " عبد " حضرت ابراہیم ، موسیٰ ، ہارون ، ایوب ، الیاس سلیمان ، داود ، نوح ، اور یوسف علیہم السلام وغیرہ کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ (سورۂ صافات آیات: ۱۲۲،۱۱۲ ۔ سورہ ص آیات ۴۱ ، ۳۰ ، ۱۷ ۔ سورۂ اسراء آیت : ۳ ۔ سورہ یوسف آیت : ۲۵ ۔)

مخلص

یعنی وہ جو صرف خدا کے لئے عمل کرتا ہے اور سوائے خوشنودی و رضائے پروردگار کے خود کوئی نظریہ یا خیال نہیں رکھتا اور نہ کسی طرح کی ظاہرداری ، ریاکاری ، خود پرستی اور ہوا و ہوس کو اپنے اعمال میں جگہ دیتا ہے ۔ یہ کلمہ حضرت یوسفؑ کے لئے سورۂ یوسف کی ۲۵ ویں آیت میں استعمال ہوا ہے

حنیف

اس کے معنی بھی یہ ہیں کہ خدا کے لئے بے لاگ اور خالص عمل انجام دیتا ہے ۔ اسی پر اعتقاد رکھتا ہے ۔ اس کی توجہ و نگاہ کا مرکز صرف خدا کی ذات ہوتی ہے ۔ اس کی عبادت و عمل میں شرک کی گرد بھی نہیں پائی جاتی ۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے ذکر ہوا ہے ۔ (سورۂ نحل ، آیت ۱۲۲)

مسلم

یعنی جو حکم خدا کے آگے تسلیم ہے اور کسی بھی حالت یا خطرے میں اس کے حکم کی اطاعت سے

منہ نہیں موڑتا، کوئی لالچ، دھمکی، یا وسوسہ اس کے آہنی عزم میں خلل انداز نہیں ہوتا اور نہ اسے خدا کی راہ سے دور کرتا ہے۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل کے لئے ذکر ہوا ہے۔ (سورہ بقرہ آیات ۱۲۹ - ۱۳۲)

صالح

وہ جس کا عمل نیک و شائستہ ہے اور کسی طرح کی بدی، سستی، کجی اور آلودگی اس میں نہیں پائی جاتی۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، زکریاؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۳۱ - سورہ صافات آیت ۱۱۳ - سورہ آل عمران، آیات ۴۰ - ۴۷، سورہ انعام، آیت ۸۵ - سورہ انبیاء آیت ۸۵)

محسن

یعنی نیکوکار۔ جو لوگوں کے ساتھ اس قدر نیکی کرے اور اچھے اعمال بجا لائے کہ اسے نیکوکار کہا جانے لگے۔ یہ کلمہ حضرت موسیٰؑ، ہارونؑ، یوسفؑ اور نوحؑ کے بارے میں آیا ہے۔ (سورہ صافات آیت: ۱۲۲ - سورہ یوسف آیت: ۲۲ - سورہ ص، آیت ۸۲)

صدیق

جو شخص بہت زیادہ سچا ہو۔ جس کی رفتار و گفتار سے سوائے سچائی اور بہتری کے کچھ اور ظاہر نہ ہوتا ہو۔ یہ لفظ حضرت یوسفؑ و ادریسؑ کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ (سورہ یوسف آیت ۴۷ - سورہ مریم، آیت: ۵۵)

صابر

جو شخص بردبار، متحمل اور مضبوط ارادہ کا حامل ہو۔ تمام مشکلات میں ثابت قدم رہے۔ یہ لفظ اولوالعزم پیغمبروں اور جناب ایوبؑ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (سورہ احقاف، آیت: ۳۵،

سورہ صٓ، آیت : ۴۱) ۔

امین

یعنی جو صحیح اور قابل اعتماد ہے، کبھی خیانت نہیں کرتا، یہ لفظ حضرت موسیٰ اور ہودؑ کے لئے آیا ہے (سورۂ دخان، آیت ۱۹ - سورۂ اعراف آیت : ۶۸)

حصور

عفیف و پاکدامن، ہوا و ہوس سے پاک و بری - یہ لفظ حضرت یحییٰ کے لئے ذکر ہوا ہے (سورۂ آل عمران آیت ۴۰

تقی

پرہیزگار، جو شخص گناہ، گمراہی و کجروی کے مقابلے میں مقاوم و ثابت قدم رہے اور کسی غلط اور ناپسندیدہ عمل میں ملوث نہ ہو۔

صادق الوعد

جو شخص اپنے کئے ہوئے وعدہ کو وفا کرتا ہے اور اپنے عہد و پیمان و قول و قرار میں سچا رہتا ہے یہ لفظ حضرت اسماعیل کے لئے ذکر ہوا ہے (سورۂ مریم، آیت : ۵۴)

کریم

یعنی جو شخص بخشنے اور درگزر کرنے والا ہو کریم النفسی اور بزرگی سے کام لیتا ہو - یہ لفظ حضرت موسیٰؑ کے لئے (سورۂ دخان آیت ۱۹) میں ذکر ہوا ہے -

رفوج

شکور

شکرگزار بندہ۔ یعنی جو خدا کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے اور انھیں راہ خیر میں صرف کرتا ہے۔ ان کے سلسلہ میں خدا کے احکام سے روگردانی نہیں کرتا اور ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ کلمہ حضرت نوحؑ کے لئے (سورۂ اسراء۔ آیت: ۳) میں آیا ہے۔

مرضی

وہ شخص جس سے خدا راضی و خوشنود ہے۔ یہ لفظ حضرت اسماعیلؑ کے لئے (سورۂ مریم آیت ۵۴) میں ملتا ہے۔

حلیم

بُردبار یعنی جو شخص اپنا غصہ پی جاتا ہو اور دوسروں کی بدسلوکی و بے ادبی کے مقابلہ میں حلم و متانت کا اظہار کرتا ہو جذبات کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہو جاتا۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ توبہ آیت ۱۱۵) میں آیا ہے۔

عابد

جو شخص اپنے پروردگار کی پرستش و عبادت کرتا ہو، صرف اس کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کا اظہار کرتا ہے اور اس کے فرمان سے بغاوت نہیں کرتا۔ یہ لفظ حضرت اسحاق و یعقوبؑ کے لئے (سورۂ انبیاء آیت ۷۲) میں ذکر ہوا ہے۔

اوّاب

جو شخص خدا کی جانب رجوع کرتا ہے اور ہر خطا و گناہ و گمراہی کی منزل میں اسی کی پناہ حاصل کرتا ہے اور توبہ و استغفار کی راہ سے تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہ لفظ حضرت داؤدؑ، سلیمانؑ اور ایوب کے بارے میں ذکر ہوا ہے (سورۂ ص آیات: ۱۷، ۳۰، ۴۱)

اوّاہ

وہ شخص جو اپنے پروردگار کے حضور خائف و خاشع ہوتا ہے اور اس کی عظمت کے سامنے اپنی بے مایگی کا اظہار کرتا ہے اور اس کے جلال و جبروت کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ یہ کلمہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ توبہ، آیت ۱۱۵) میں ذکر ہوا ہے۔

قانت

یعنی عابد۔ خدا کی بارگاہ میں خاضع و خاشع رہنے والا اور اس کی جناب میں سر تسلیم خم کرنے والا۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ نحل، آیت: ۱۲۲) میں ذکر ہوا ہے۔

خیر

خوب اور نیک، بہتر اور نیکوکار۔ یہ لفظ حضرت اسماعیلؑ، الیسعؑ، ذاالکفلؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے لئے (سورۂ ص، آیت: ۴۸ و ۴۵) میں ذکر ہوا ہے۔

مصطفیٰ

پاک، برگزیدہ، انتخاب کیا ہوا، یعنی وہ شخص جو دوسروں سے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ یہ کلمہ حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ و یعقوبؑ کے سلسلے میں استعمال ہوا ہے۔ (سورۂ ص، آیت: ۴۵)

مقرّب

یعنی خدا سے نزدیک ہو یعنی تمام انسانی پاکیزہ صفات و فضائل و کمالات سے نہ صرف آراستہ ہو بلکہ ان میں اس قدر پیش قدم ہو کر فضائل و کمالات کے منبع یعنی خدا سے نزدیک ہو جائے اور اس کے لطف و عنایات کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ یہ لفظ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں (سورۂ آل عمران آیت: ۴۷) میں ذکر ہوا ہے۔

سنت مطابقت حقیقت سے نعبہ

وجیہ

آبرو مند، محترم، قابل ستائش اور دنیا و آخرت میں سربلند۔ یہ کلمہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے (سورہ آل عمران، آیت: ۴۵) میں آیا ہے۔

سید

پاک و پاکیزہ، آزاد منش، جو شخص روحی طور پر آقا و سردار اور طبیعی و فطری طور پر محکم و پائدار ہو ان کے اُن کے سامنے نہیں جھکتا، چاپلوسی نہیں کرتا۔ مادی طاقتیں اور ہیبتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ یہ لفظ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں (سورہ آل عمران، آیت ۳۹) میں ذکر ہوا ہے

ذاالاید

یعنی قوی و توانا اور جو شخص ہنر مند ہو۔ یہ کلمہ حضرت داودؑ کے لئے (سورہ ص، آیت ۱۷) میں ذکر ہوا ہے۔

ناصح

خیر خواہ، پند و نصیحت کرنے والا۔ جو شخص صرف لوگوں کی بھلائی چاہتا ہے اور اس راہ میں جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی خدمت کرے۔ یہ لفظ حضرت ہودؑ کے بارے میں (سورہ اعراف، آیت: ۶۸) میں ذکر ہوا ہے۔

بعض صفات ایسے بھی ہیں کہ انبیاء کرام سے ان کی نفی کی گئی ہے مثلاً:

جبار

یہ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ جبار یعنی سرکش، ظالم، قاتل، ستمگر اور جارح نہیں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ صفات جو قیصر و کسریٰ میں پائے جاتے تھے پیغمبرؑ سے ان کی نفی کی گئی ہے۔ (سورہ مریم، آیت: ۱۴)

عصمت

جناب یحییٰؑ کے بارے میں یہ بھی آیا ہے۔ یعنی آپ حکم خدا کے مقابلہ میں نافرمان و گستاخ نہیں تھے۔ اور معصیت و گناہ نے آپ کے دامن کو آلودہ نہیں کیا ہے۔

بقیہ صفات و فضائل کو پیغمبر اسلامؐ سے مخصوص بحث کے ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

آخر میں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جسطرح انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کی اساس مشترک اور ایک ہے اسی طرح ان کے فضائل و صفات بھی ایک جیسے اور مشترک ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک صفات بعض پیغمبروں کے لئے ذکر کئے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صفات و فضائل کا ظہور ان پیغمبروں سے مربوط واقعات و حوادث کے ذریعہ زیادہ ہوا ہے۔ یا ان پیغمبروں کی زندگی میں ان صفات کے جلوے دوسرے انبیاء سے زیادہ نظر آئے ہیں۔ اگرچہ مذکورہ تمام صفات و فضائل کو عمومی طور سے سبھی انبیاء کے فضائل میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعض صفات

قرآن میں انبیائے کرامؑ کے معنوی چہرے سے متعلق بحث کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ چند آیات کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بھی اشارہ کر دیا جائے۔ اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں الگ سے مستقل اور مفصل بحث آئندہ کی جائے گی۔

عبد

سورۂ حدید کی نویں آیت میں ارشاد ہے کہ "خدا ہی ہے جس نے اپنے بندہ (محمدؐ) پر کھلی ہوئی نشانیاں نازل کی ہیں"۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ عبد وہ بہترین صفت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ کیونکہ خدا کی بندگی ہی میں آزادی ضمیر، سربلندی، استقامت و پائداری، شہامت و اولوالعزمی اور تسلیم و رضا جیسے صفات پوشیدہ ہیں۔

کریم

سورۂ حاقہ کی آیت ۴۰ میں ارشاد ہے: اِنَّهُ لَقَولُ رَسُولٍ كَرِيمٍ "بے شک یہ رسول کریم کا قول ہے" اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کریم کے معنی بزرگی، کرامت نفس اور درگزر کرنے

کے ہیں۔

سورۂ قلم" کی پانچویں آیت میں ارشاد ہے : "وَاِنَّكَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ" بلاشبہ آپ عظیم و بہترین خلق و عادت کے مالک ہیں۔ اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام بہترین خوبیوں، اخلاق حسنہ اور عظیم روحی صفات سے آراستہ تھے آپ ایسے باعظمت صفات کے حامل تھے کہ خود خدا بھی ان خصال و صفات کو "عظیم" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

سورۂ اعراف" کی آیت نمبر ۱۵۸ میں پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں ارشاد ہے : "الذی یؤمن بِاللّٰہِ وَکَلِمَاتِہٖ" وہ پیغمبرؐ جو خدا اور کلمات الٰہیہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اپنے مقصد و ہدف پر ایمان رکھنا ایک ہادی و رہبر کے ضروری و ممتاز صفات میں سے ہے۔ جو رہبر ہے اسے چاہیئے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر یقین و ایمان بھی رکھتا ہو۔ ورنہ موسمی لیڈر اور خود خواہ رہبر تو اپنے خاص حالات کے تحت باتیں بناتے ہیں اور اپنی پالیسیوں میں تبدیلیاں لاکر پے در پے اپنے منافع و مصالح کے تحفظ کے تحت نئے نئے منصوبے پیش کرتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ کی ترقیوں کی اولین شرط خدا اور اس کے احکام پر ان کا محکم و پائیدار ایمان تھا اور حضرت رسول اکرمؐ کے سلسلہ میں اس حقیقت کی صراحت کی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے :

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" آل عمران / ۱۵۹

یعنی لطف و رحمت پروردگار کی خاطر آپ لوگوں کے لئے نرم دل اور مہربان ہو گئے اور اگر بدخو و سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور ہو جاتے اور پراگندہ ہو جاتے۔

چنانچہ اخلاق آنحضرتؐ عدیم المثال تھا۔ آپ نرم گفتار اور مہربان تھے۔ خشونت اور سخت گیری آپ میں نام کو نہ تھی۔ سورۂ والنجم کی آیات ۲، ۳ اور ۴ میں ارشاد ہے :

"مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى"

یعنی تمہارا پیغمبر نہ گمراہ ہے اور نہ دھوکہ دینے والا ہے وہ اپنی خواہش نفسانی کے تحت کلام نہیں کرتا، اور جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر وحی نازل ہوئی ہے۔

ان آیات کے ابتدائی فقروں میں پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی سے دھوکہ و فریب و گمراہی کی نفی کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد اس کا اضافہ کیا گیا ہے کہ آپ کی باتیں ہوس و بیجا اغراض سے آلودہ نہیں ہوتیں اگر کسی میں مذکورہ دو تین پہلو صحیح معنی میں نہ پائے جائیں تب بھی وہ انسانی و معنوی فضائل و کمالات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی تائید کہ جو کچھ آپؐ فرماتے ہیں اس کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے اور وہ وحی کی شکل میں آپ پر نازل ہوتا ہے۔ یہ امر خود آپ کے احکام و آثار کو کس قدر وقعت و عظمت عطا کرتا ہے۔

قیام ۔ سجود ۔ سورۂ شعراء کی ایک آیت نمبر ۲۱۸ میں ارشاد ہے: "وہ خدا جو تمہیں ہنگام نماز قیام کی حالت میں اور جب تم سجدہ کرنے والوں کے ہمراہ سجدہ میں غلطاں ہوتے ہو دیکھتا ہے"۔ یہ آیت خدائے برتر کی عبادت و پرستش کے تحت پیغمبر اکرمؐ کے والا مقام اور اسی کی بارگاہ میں ان کے خضوع و خشوع کو ظاہر کرتی ہے۔ آپؐ کے اندر خدا کی عبادت و بندگی کا اس قدر انہماک ہے کہ خدا خود اس کا تذکرہ اس شان سے فرماتا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت: ۱۲۸ میں ارشاد ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ"

درحقیقت تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک پیغمبر آیا ہے جس پر تمہاری تکالیف و مصائب شاق ہیں اور جو تمہاری نجات اور خوشبختی کا حد درجہ خواہاں ہے اور صاحبانِ ایمان پر بڑا انتہا مہربان و رحیم کرنے والا ہے،،

اگر اس آیت پر خوب دقت کی جائے تو عالم تاریخ کا ایک عالی ترین اور درخشاں ترین چہرہ اس میں نظر آئے گا۔ ایسا شخص جس کی روح پر لوگوں کے رنج و غم، فقر، جہالت، اختلاف، ذلت غلامی، فساد و بدبختی گراں گزرتے ہیں اور وہ ان باتوں سے اپنے قلب پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہے۔ یعنی وہ سب سے زیادہ لوگوں کی فلاکت و بدبختی پر فکر مند ہوتا ہے اور ان کی پستی و جہالت پر رنجیدہ خاطر ہوتا ہے۔ یہ شخصیت ان سب سے الگ ہے جو صرف اپنے لئے سوچتے ہیں اور اپنی فقر و ناتوانی پر غمزدہ ہوتے ہیں۔ وہ تنہا سب کے درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی بلند و بالا روح کی حامل شخصیت بنی نوع انسان کی نجات کے سلسلہ میں کس قدر فدا کاری سے کام لے گی اور اسے لوگوں کی بھلائی کا کتنا خیال ہوگا۔ اس آیت سے ہمیں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ آنحضرتؐ لوگوں کی سعادت و نیک بختی کے لئے بے انتہا حرص و طمع رکھتے ہیں یعنی آپؐ کو صرف لوگوں کی نجات و خوش بختی اور خدمت خلق کی فکر اور والہانہ شوق ہے۔ وہ شخص جس کی تمام تر فکر و کوشش لوگوں کی فلاکت و جہالت دور کرنا اور لوگوں کی خدمت کرنا ہو وہ خود غرض خود خواہ اور مطلبی نہیں ہو سکتا۔ اسے صرف اپنے نفع کی فکر نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں پر حد درجہ مہربان اور سراپا رحم و کرم ہے۔

وہ معاشرہ کی فلاح اور ہدایت و نجات کے کیف میں اس قدر غرق ہے کہ لوگوں کی گمراہی و فلاکت پر رنج و غم میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ خداوند عالم سورۂ "فاطر" کی آیت نمبر ۸ میں اسے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ" ان لوگوں کے سلسلہ میں اس قدر رنج و افسوس نہ کرو (کہ اس رنج و غم میں اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو) یہ مطلب قرآن کی متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ اور ان تمام آیتوں میں پیغمبر اسلام ؐ کو لوگوں کے سلسلہ میں بے انتہا درد و الم کا احساس کرنے سے روکا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ؐ اپنے پورے احساسات و جذبات کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کی فکر میں مشغول رہتے تھے اور ان کی بدبختی و گمراہی پر رنجیدہ خاطر ہو جایا کرتے تھے۔ آپؐ دل سے یہ چاہتے تھے کہ سب راہ راست پر آجائیں اور خوشبختی و کمال حاصل کریں۔ سچ ہے کہ: "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ" "خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیسے شخص کو منصب رسالت کے لئے انتخاب فرمائے"۔ (سورہ انعام، آیت: ۱۲۵)

معجزہ

نبوت کی بحث میں جن مسائل کا ذکر ضروری ہے ان میں ایک "معجزہ" بھی ہے۔ معجزہ کا مطلب ہے "اعجاز" یعنی لاجواب کر دینا۔ چونکہ پیغمبر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ خدا کی جانب سے اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور وحی دراصل ایسی چیز نہیں ہے جسے انسان درک

کر سکے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ لوگوں پر کسی اور ذریعہ سے اس کی پیغمبری کی حقانیت ثابت ہو تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حقیقتاً خدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کے احکام و معارف کی پائداری گفتگو میں حسن تاثیر، کلام کی دلنشینی اس کی ذاتی پاکیزگی اور صلح جوئی، عفو و درگزر، فداکاری، خیر خواہی، خدمت کا جذبہ اور معاشرہ کی فلاح و نجات سے اس کا لگاؤ ہی بہت سے لوگوں کے لئے اس کی نبوت کی کافی و محکم دلیل ہے اور اسی وجہ سے لوگ اس پر ایمان بھی لاتے ہیں لیکن پیغمبرؑ کے لئے بہرحال معجزہ ضروری ہوتا ہے ۔ کیونکہ مذکورہ بالا کمالات و صفات جھوٹوں، منفعت پرستوں اور باطل کا ادعا کرنے والوں کے لئے راہیں بند نہیں کر سکتے اور ممکن ہے یہ لوگ یوں ہی اپنے حق میں بھی توہمات کے جال بُن کر ان کی صداقت و حقانیت کا دعویٰ کرنے لگیں اور اپنی دعوت کو بہتر اور اپنے کلام کو پُراثر ثابت کرنے کی باتیں کریں

قرآن میں معجزہ کو آیت اور بینہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یعنی پیغمبروں کی رسالت کی نشانی اور ان کی حقانیت کو آشکار کرنے والا عمل یا اثر ۔ معجزہ کسی بھی علمی پیمانہ یا معیار پر پرکھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی لوگوں کے لئے قابل عمل ہے ۔ کوئی بھی شخص کتنا ہی ماہر فن و تجربکار ہو کسی بھی علم یا طاقت و ہنر کے ذریعہ وہ عمل یا انجام نہیں دے سکتا ۔

معجزہ، جادو، سحر، شعبدہ بازی، دست شناسی، فال گیری، علم جبر، علم اعداد، طلسمات یا پیشین گوئی یا ریاضت کشوں کی حرکتوں سے بڑا فرق رکھتا ۔ کیونکہ اس طرح کے امور زیادہ تر خرافات ہونے کے علاوہ ۔ دروغ گویوں اور دھوکہ بازوں کے ہاتھوں کے ہتھکنڈے ہیں ۔ مزید یہ کہ اگر کسی شاذ و نادر موقع پر کوئی عمل انجام پا جائے یا یہ لوگ اگر کوئی پیشین گوئی کر بھی دیتے ہیں تو یہی عمل دوسرے بھی انجام دے سکتے ہیں ۔ یعنی ایسا ہی جادو یا شعبدہ بازی وغیرہ دوسرے جادوگر یا شعبدہ باز بھی کر دکھاتے ہیں، بہرحال یہ ایک ایسا فن یا حیلہ گری ہے جو ان ہی جیسے لوگوں کے ذریعہ قابل تکرار یا قابل تقلید ہے ۔ اس کے علاوہ ایسے امور نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ اکثر و بیشتر ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ لوگوں کے سامنے ایسی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو حقیقت و واقعیت کے خلاف ہوتی ہیں ۔ اور اس سے قطع نظر کہ یہ کام دوسرے بھی انجام دے سکتے ہیں آدمی انھیں ظاہر کرنے کے لئے کسی آلہ، وسیلہ اور کسی خاص منصوبہ و نقشہ کا بھی محتاج ہوتا ہے ۔ اور یہی وسائل و آلات، اور منحصر ہے اس عمل کو دوسروں کے لئے بھی قابل عمل بنا دیتے ہیں

معجزہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ ایک ایسی واقعیت ہے جسے سب محسوس کر سکتے ہیں جبکہ اس کے اجراء کے لئے کسی آلہ یا وسیلہ کا سہارا بھی نہیں لینا پڑتا۔ یعنی ایسا مُردہ جو برسوں پہلے موت کا شکار ہو کر اس دنیا سے کوچ کر چکا ہے جناب عیسیٰؑ کے حکم سے خاک سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوسرے زندہ انسانوں کی طرح زندگی گزارنے لگتا ہے جبکہ اسے زندہ کرنے میں نہ کوئی دوا یا وسیلہ کام میں لایا گیا اور نہ یہ ایسا عمل ہے جسے دوسرے انجام دے سکتے ہیں۔

اب جبکہ ایک حد تک معجزہ کی حقیقت اور اس کی ضرورت واضح ہو گئی۔ اس سے متعلق دو بنیادی بحثوں کی جانب توجہ بھی لازمی ہے

۱۔ قرآن کی رو سے انبیاء کی حیات میں معجزہ کا وجود۔

۲۔ علم اور معجزہ کے درمیان ہم آہنگی۔

پہلی بحث کے سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء کرام کی جانب جن معجزات کی نسبت دی گئی ہے ان کی تاویل و توجیہ عادی و معمولی حادثات و واقعات کی شکل میں کی جا سکتی ہے۔ اور بظاہر اس تاویل و توجیہ کے لئے انھوں نے خاصی زحمتیں بھی اٹھائی ہیں کہ کسی بھی طرح معجزہ کے سلسلے میں موجودہ علوم کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات سے چھٹکارا پالیں۔ ہم کسی اور مسئلہ میں پڑنے سے پہلے ایک نگاہ قرآن پر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ واقعی قرآن نے معجزات کی نسبت انبیاء کی طرف دی ہے اور انھیں اس کمال سے متصف فرمایا ہے یا نہیں تاکہ بعد میں ہم علم اور معجزہ کے درمیان رابطہ پر گفتگو کر سکیں۔

انبیائے کرام کے معجزات

۱۔ حضرت ابراھیمؑ

سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۶۰ میں ارشاد ہے: ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے درخواست کی کہ وہ انھیں دکھادے کہ قیامت کے دن مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا: کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا میں قیامت اور مُردوں کے زندہ کئے جانے پر ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں میرا قلب مطمئن ہو جائے۔ خداوند عالم نے حکم دیا چار پرندوں کو پکڑ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے

کر ڈالو اور سب کا گوشت باہم ملا دو اور ہر پہاڑ پر اس گوشت کا کچھ حصہ رکھ دو پھر ہر پرندہ کو آواز دو تم دیکھو گے کہ کس طرح ہر ایک کے بدن کے ٹکڑے آ کر باہم مل جاتے ہیں اور دوبارہ وہ پرندہ مکمل شکل و صورت میں زندہ ہو جاتا ہے۔

یا سورۂ ہود کی ۷۲ ویں آیت میں جناب ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ کے عالم پیری میں صاحب اولاد ہونے کی خوش خبری ہے ان کی زوجہ اس قدر ضعیف ہو چکی تھیں کہ اولاد کی امید ہی سرے سے ختم ہو چکی تھی۔ آیت انھیں صاحب اولاد ہونے کا مژدہ سناتی ہے۔ اسی طرح سورہ انبیاء کی آیت : ۷۰ میں مہیب آگ کا واقعہ ذکر ہے جو جناب ابراہیمؑ کو نذرِ آتش کرنے کے لئے بھڑکائی گئی تھی اور انھیں اس میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ آگ خداوند عالم کے حکم سے جناب ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی ہو کر سلامتی کا باعث بنی۔

۲۔ جناب موسیٰؑ

سورۂ اعراف ۱۵۹ ویں آیت میں جناب موسیٰؑ کے اس عصا کا واقعہ مذکور ہے جسے آپ نے پتھر پر مارا تو اس سے بارہ چشمے ابلنے لگے ان بارہ چشموں سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے سیراب ہوتے تھے سورۂ طٰہٰ کی آیات : ۱۷ تا ۲۲ میں عصائے جناب موسیٰؑ کا یہ واقعہ ذکر ہوا ہے کہ آپ نے اسے خدا کے حکم سے زمین پر ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خطرناک اژدھا بن کر حملہ کرنے لگا۔ جناب موسیٰؑ کو حکم ہوا اسے دوبارہ ہاتھ میں پکڑ لیں آپ نے جیسے ہی اسے اٹھایا وہ دوبارہ عصا بن گیا۔ اس آیت میں "ید بیضا" کا واقعہ بھی ذکر ہوا ہے۔ یعنی جناب موسیٰؑ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں لے جاتے اور جب باہر نکالتے تھے تو وہ نور سے درخشاں ہو جاتا تھا۔ سورۂ شعراء کی آیت : ۶۳ میں ہے کہ جناب موسیٰؑ اپنا عصا دریائے نیل پر مارتے ہیں اور اس کے درمیان موسیٰؑ اور انکی قوم کے لئے راستہ بن جاتا ہے اور سب کے سب دریا کے پار ہو جاتے ہیں۔

۳۔ حضرت سلیمانؑ

سورۂ نمل کی آیات (۱۸ تا ۴۱) میں جناب سلیمانؑ کا چیونٹی سے باتیں کرنا، ہدہد سے کلام کرنا، جنوں کا آپ کی مدد کرنا، تخت بلقیس (ملکہ سبا) کا ایک طویل مسافت طے کر کے پلک جھپکتے آپ کے دربار میں لایا جانا ذکر ہوا ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ

سورہ آل عمران کی آیت ۴۵ میں جناب مریمؑ کے صاحب اولاد ہونے اور بغیر کسی مرد کی قربت کے انھیں جناب عیسیٰ کی ماں بننے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ نیز قرآن میں جناب عیسیٰ کے گہوارہ میں کلام کرنے پرندہ کا مجسمہ بنا کر اس میں روح پھونکنے اور زندہ کرنے، اندھے و مبروص افراد کو شفا بخشنے مُردوں کو زندہ کرنے اور جو کچھ لوگوں نے کھا رکھا تھا یا گھروں میں چھپا رکھا تھا اس کی خبر دینے کا تذکرہ موجود ہے

۵۔ حضرت یونسؑ

سورہ یونس کی آیت ۹۸ میں یہ واقعہ ہے کہ جناب یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا اور ایک زمانہ تک آپ اسی کے پیٹ میں زندہ رہے اور آخر کار ایک روز اس سے نجات پائی۔

۶۔ حضرت داؤدؑ

سورہ انبیاء کی آیت : ۸۰ میں جناب داؤدؑ کے ذریعہ پہاڑوں اور پرندوں کے تسخیر ہونے کا ذکر موجود ہے۔

۷۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

سورہ بقرہ کی آیت : ۲۳ میں قرآن کے اعجاز ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کے ایک سورہ کا بھی جواب نہیں لاسکتا۔ یہ ان سیکڑوں اعجاز آمیز واقعات کے چند نمونے تھے جنھیں قرآن مجید انبیاء کرام کے سلسلہ میں بیان کرتا ہے۔ اس قسم کی آیات پر غور کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن کی نظر میں انبیاء کے لئے معجزہ کو قطعی قرار دیا گیا ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ آیا معجزات علمی معیار و میزان پر پورے اترتے ہیں یا نہیں اور اگر علمی معیار پر پورے نہیں اترتے تو ان کی توجیہ کس طرح کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ بحث ہے جسے ہم آئندہ پیش کریں گے۔

معجزہ کی محدودیت

یہاں ایک چھوٹے سے نکتہ کی جانب اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہر پیغمبر مخصوص معجزہ یا معجزات کا حامل رہا اور اس نے ان معجزات کو خداوند عالم کے اذن سے ضروری و لازمی مواقع پر لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جب بھی کسی نے چاہا یا فرمائش کی کہ وہ لوگوں کے حسب

دلخواہ معجزنمائی کرنے لگے اور ہر روز لوگوں کی دلبستگی کے لئے معجزہ دکھانے بیٹھ جائے۔ اصولاً انبیاء کرامؑ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے تشریف لائے تھے اور فقط خاص و محدود مواقع پر جیسی ضرورت ہوتی تھی خداوند عالم کے حکم سے ویسا معجزہ ظاہر فرماتے تھے۔ بہر حال نہ وہ لامحدود امکانات رکھتے تھے اور نہ لامحدود قدرت کے مالک تھے یہ اعجاز نمائی ہمیشہ اور لوگوں کے حسب دلخواہ نہیں ہوا کرتی۔ اس بنیاد پر ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بعض شیعوں کی اپنے ائمہ معصومینؑ سے یہ توقعات ان ہی بے جا توقعات کی شبیہ ہیں جو بعض افراد پیغمبرؐ سے رکھتے تھے اور آنحضرت سے ہر لحظہ معجزات کی فرمائش کیا کرتے تھے لیکن قرآن انھیں یہ جواب دیتا ہے کہ یہ کام پیغمبروں کی خواہش اور ان کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ معجزہ خداوند عالم کے اذن اور اس کے حکم سے ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیئے کہ ان بزرگواروں کی زیارتوں اور ان سے توسّل وارتباط کے ذریعہ اپنے اخلاق و کردار کو سنواریں اور یہ نہ بھولیں کہ یہ حضرات ہماری زندگی کے رہبر و پیشوا ہیں نہ یہ کہ ہم ہمیشہ ان سے کسی معجزہ کی توقع رکھیں۔

علم اور معجزہ کا ربط

محققین کا ایک گروہ ادیانِ عالم کے سلسلہ میں جو رائے رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ معمولاً تمام آسمانی ادیان میں معجزہ کی بات سامنے آتی ہے اور انبیاء کرام اور دینی پیشواؤں سے متعلق ایسے ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں جو عادت و فطرت کے خلاف ہوا کرتے ہیں اور عام انسان ان امور کے انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اصولی طور پر معجزہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ پیغمبران دین اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے ایسے کام انجام دیتے ہیں جنھیں دوسرے انجام نہیں دے سکتے۔ اس بنا پر لوگ متوجہ ہوتے ہیں کہ انبیاء مافوق بشر قوت وطاقت کے حامل ہیں اور خداوند عالم کی جانب سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہ خدائے قوی و دانا ہی ہے جو ان کی حمایت میں ان کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں ایسے امور ظاہر کرتا ہے۔

آج معجزہ کے سلسلہ میں بڑی بحثیں ہیں، لیکن یہاں جو موضوع پیش نظر ہے یہ ہے کہ علم اور معجزہ میں کیا رابطہ ہے۔ یعنی انبیاء کرامؑ کے معجزات کی توجیہ علمی قوانین کی روشنی میں کس طرح

کی جا سکتی ہے یہاں ایک اعتراض یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ :۔
ہم جانتے ہیں کہ علمی قوانین ثابت ، اٹل اور ناقابل تغییر ہیں اور ان کا یہی ثبات و دوام گوناگوں صنعتوں ، حرفتوں ، اختراعات و ایجادات کا باعث ہوا ہے جبکہ معجزہ کے ذریعہ علمی قوانین اور مسلمہ اصول ٹوٹتے نظر آئے ہیں ۔ اور چونکہ ہم قبول کر چکے ہیں کہ علم تغییر پذیر نہیں ہے ، لہذا ان معجزات کی حقیقت و واقعیت سے ہمیں انکار کر دینا چاہیئے اور اس انکار کا دامن خود بخود ادیان اور ان کے اصول تک پھیلتا چلا جاتا ہے ۔

مثال کے طور پر : ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا معجزہ ایک عصا تھا جسے آپ زمین پر ڈال دیتے تھے تو وہ ایک ایسے خطرناک اژدھے میں تبدیل ہو جاتا تھا جس سے لوگ وحشت زدہ ہو جاتے تھے ۔ جبکہ بنیادی طور پر لکڑی کے ایک ٹکڑے کا فطری قوانین ، فزیکس اور بایولوجی کی روشنی میں ایک زندہ عظیم و قوی حیوان میں تبدیل ہو جانا ممکن ہی نہیں ہے ۔

حضرت عیسیٰؑ مُردہ کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور پیدائشی اندھے کو آنکھ والا بنا دیا کرتے تھے ۔ جبکہ ایک بے جان جسم میں جان ڈالنا علمی نقطۂ نظر سے ایسا مسئلہ ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا ہے ۔ میڈیکل سائنس اور بایولوجی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتی ۔ یہی صورت قوم موسیٰؑ کے لئے دریا کے دو حصوں میں تقسیم ہو کر راستہ بن جانے اور جناب ابراہیمؑ کے لئے آگ کے سرد ہو جانے جیسے معجزات کی ہے ۔

اس اعتراض کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے جن میں سے ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

(۱۔ پہلا جواب وہی عام طور پر دیا جانے والا جواب ہے جسے تمام اہل دین اپناتے ہیں ، اور وہ یہ کہ یہ معجزات خداوند عالم کے اذن اور اس کے ارادہ سے انجام پاتے ہیں ۔ اور خدا کی قدرت و قوت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے ۔ یعنی جو خدا ہر شئی کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور ہر شئی کا خالق ہے وہ جناب عیسیٰؑ کی طرح ایک انسان کو بغیر باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے ۔

اس سلسلہ میں اک ذرا گہرائی میں اتر کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم اور طبیعی ۔ فطری قوانین دراصل اشیاء کے باہمی ارتباط ، تاثیر و تاثر اور مثبت و منفی عوامل کا ہی نام ہے جو اس

جہانِ خلقت میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم اس کائنات کا خلق کرنے والا ہے اور اس نے ہی ہر چیز کے لئے ایک حساب اور ایک قانون معین فرمایا ہے۔ یعنی یہ تمام قوتیں عوامل و قوانین عناصر و موجودات عالم کے تغیر و تبدّل کی ہی حکایت کرتے ہیں۔ اور یہ سب خدا کے تکوینی مقرّرات ہیں جو عالم کی خلقت کے ساتھ ہی تقرر کر دیئے گئے ہیں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے

"یہ چاند و سورج ایک نظام اور ایک طے شدہ حساب و کتاب کے تابع ہیں۔ خدا نے آسمان کو بلند فرمایا اور ہر چیز کے لئے ایک میزان اور ایک نظم قائم کیا ہے۔" (سورہ رحمٰن آیات ۵۔۷)

اب جبکہ یہی نظام خلقت علم ہے، تو اس کائنات کو نظم عطا فرمانے والا خود اپنے بنائے ہوئے نظم و قانون کا ہرگز پابند و مجبور نہیں ہے۔ اگرچہ نظام عالم کی حفاظت اسے استحکام و قاطعیت بخشنے اور تمام موجودات عالم فطرت کی باہمی روابط کو برقرار رکھنے کے لئے خدا خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی رعایت کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے پیدا کردہ نظام کی بنیاد پر ہی چلاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس نظام کو تبدیل کرنے سے مجبور نہیں ہے خاص طور پر اس وقت جب کوئی مصلحت درپیش ہو اور یہ عمل لوگوں کی بیداری اور انسانی معاشرہ کی آگاہی کے لئے مفید بھی ہو۔ ایسی صورت میں وہ عام نظام کے خلاف روابط کا ایک نیا سلسلہ قائم کر دیتا ہے مثال کے طور پر عورت کے نطفے سے انسان خلق فرماتا ہے۔ یا جلا دینے اور پگھلا دینے والی آگ کو نہ صرف سرد بنا دیتا ہے بلکہ اس میں حفاظت و سلامتی کے عناصر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ خدا کی قدرت لامحدود ہے اور وہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کا پابند نہیں ہے۔

۲۔ ایک دوسری راہ حل جو شاید زیادہ قابل قبول ہو، یہ ہے کہ بہت سے دانشوروں اور فلسفیوں کا اعتراف ہے کہ انسان ابھی دنیا کی حقیقت و واقعیت کو نہیں پہچان سکا ہے۔ وہ ابھی تمام قوانین، اثر انداز عوامل اور موجودات عالم کو بخوبی دریافت نہیں کر سکا ہے۔ علمی قوانین کی بنیادیں ثابت، استوار اور قطعی ہونے کے باوجود نسبی و تغیر پذیر ہیں کیونکہ ایسے ناشناختہ عوامل بھی ہیں جو ان موجودات میں تغیر و تبدیلی لاتے ہیں۔ اسی وجہ سے آئن اسٹائن کے نسبیت کے قوانین نے فزیکس اور علمی قوانین اور بنیادوں کو دگرگوں کر دیا اور جسم سے متعلق

زمان وحرکت و رفتار اور اسی طرح کے بہت سے مسائل سامنے آئے۔ اگرچہ انسان اپنے علمی ارتقار کے ہر مرحلے میں اپنی معلومات سے ایک حد تک استفادہ کرنے اور ان سے اپنی زندگی کے بعض مسائل کو حل کرنے میں کامیاب رہا ہے مثلاً "بطلیموس" کے علم ہیئت جس میں وہ زمین کو ساکن اور کائنات کا مرکز تصور کرتا تھا اگرچہ یہ خیال بے بنیاد تھا لیکن اس کے باوجود اس علم نے صدیوں تک انسان کو ماہ وسال، بروج نیز چاند گہن اور سورج گہن کے حساب وکتاب وغیرہ میں مدد دی۔ بعد میں کائنات کے بارے میں "کوپرنیک" اور کیپلر" کی دریافت وانکشافات سے ستاروں کی حرکت اور ان کے مکمل نظام کی معلومات کے متعلق نئے نئے مسائل سامنے آئے اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقیوں کی نئی راہوں پر چل پڑا۔ اور آج انسان اپنے بنائے ہوئے مصنوعی چاند اور سیاروں کے ذریعے فضاؤں اور ستاروں سے متعلق نت نئے انکشافات کی جانب گامزن ہے۔

امیبوں، مائیکروبوں، بیکٹیریاؤں، وائرسوں اور مختلف قسم کے دوسرے جراثیم کی ایک دنیا ہزاروں سال سے انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ اور ناشناختہ تھی۔

یوں ہی ایٹم کی دنیا بھی علم کی نگاہوں سے عرصہ تک پنہاں رہی اور اس کے انکشاف کے بعد ہی بے شمار نئے نئے علمی مسائل سامنے آئے اور اس عظیم قوت نے کیسے کیسے انقلابات کو جنم دیا۔

آج بھی انسان خود کو اس راہ میں ایک ایسا طفل محسوس کرتا ہے جس نے ابھی چلنا سیکھا ہو۔ وہ اپنی کوششیں مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہر لمحہ اس چمن سے ایک نیا پھول چنتا ہے۔ اس مختصر سے مقدمے سے یہ بات روشن وواضح ہوجاتی ہے کہ انسان ابھی تک اشیار کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اور علم تمام قوانین فطرت اور اشیار کے باہمی ارتباطات کا احاطہ نہیں کر پایا ہے۔ سب تو سب خود انسان بھی علم کی روشنی میں ایک سربستہ راز اور "لامعلوم" وجود کی حیثیت رکھتا ہے، بڑے بڑے دانشور انسانی فیزیالوجی اس کی عقل وفہم کے رموز، یہاں تک کہ سماجیات کے میدان میں خود کو مبتدی اور تازہ وارد خیال کرتے ہیں اور ان علوم کے بہت سے شعبوں میں نو مطالعہ وتحقیق کا سلسلہ ابھی شروع ہوا ہے۔

اس بنا پر ہم آج بھی قطعی طور پر علمی قوانین کے ذریعہ معجزات کا تعالیسہ یا ان کی توجیہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم ابھی تک کائنات میں کارفرما تمام عوامل کو پہچان نہیں پائے ہیں۔ جس طرح ایک دن آسمانوں میں انسانی پرواز یا آواز یا تصویر کا دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں حتیٰ لاکھوں کیلومیٹر دور تک منتقل ہونا فقط ایک پہیلی تھا بلکہ محال نظر آتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ سب باتیں معمولی اور آسان ہو گئیں۔ یوں ہی معجزہ کو بھی غیر ممکن یا برخلاف علم تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں ہم یہ بات مانتے ہیں کہ معجزہ ایک غیر معمولی عمل ہے جو قوانین عالم، انسانی معلومات اور انسان کی محدود قوت و توانائی کے بس سے باہر ہے۔ اس روش و راہ حل کو دیکھتے ہوئے ہم مجبور نہیں ہیں کہ پہلی روش کو تسلیم کرتے ہوئے معجزات کو خود قانون بنانے والے کی جانب سے ایک طرح کی قانون شکنی سمجھیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ معجزہ صد فی صد قانونی ہو، لیکن ان قوانین کے تحت کارفرما ہو جنھیں ہم ابھی نہیں جانتے۔

تہذیب نفس

کے ذریعہ انبیاءؑ کی پیروی

جناب جوادی آملی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

آٹھویں اعتراض کا تیسرا حصہ

گذشتہ بحث میں آٹھویں اعتراض کے دوسرے حصہ کا جواب دیا گیا۔ اب اس اعتراض کے آخری حصہ پر بحث مقصود ہے۔ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی کیا ضرورت کہ منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے پھریں؟ اگر ہم دنیا کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت سے مدد حاصل کریں اور تہذیب نفس کے ذریعہ منزل کمال تک پہنچ جائیں!

جواب یہ ہے کہ یہ راہ حکمت و فلسفہ کو مسترد نہیں کرتی بلکہ یہ وہ راہ ہے جسے گذشتہ صدیوں میں بھی بعض فلسفیوں نے اپنایا ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض لوگوں نے یہ کوشش کی ہے کہ جو کچھ انبیاء کرام احکام و قوانین کی شکل میں لے کر آئے ہیں ان کی پیروی تہذیب نفس کے ذریعہ کریں۔ اور یہ بحث کی دوسری منزل ہے کیونکہ تہذیب نفس سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ: آپ جو تہذیب نفس کرنا چاہتے ہیں تو کیا آپ کی خواہش یہ نہیں ہے کہ جو کچھ آپ نے سمجھ لیا ہے اسے دوسروں سے بیان بھی کریں، اور اپنی بات کو دلیل و برہان کے ذریعہ ثابت کریں؟ اگر چاہتے ہیں تو یہی منطق کی راہ ہے لیکن اگر ہمیشہ کے لئے خاموش رہنا چاہتے ہیں جیسے بعض افراد ساکت و خاموش تھے تو یہ بھی

افلاطونی فلسفہ کی روش ہے۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فلسفہ خراب چیز ہے! اور ہمیں تہذیب نفس کی روش کو اپنانا چاہیئے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم فلسفہ کے بعض حصہ کو قبول کرتے ہیں اور بعض سے انکار کرتے ہیں۔ بالکل یوں ہی جیسے کوئی کہے کہ علم اصول کے مقدمات و مبادیات درست نہیں ہیں ۔ میں اس علم کے اس حصہ کو تسلیم کرتا ہوں جو اصولی روش کے متقابل اور اس کی ضد ، یعنی اخباریت ہے ۔اس شخص نے مقدمات میں دو میں سے ایک شعبہ کو قبول کرلیا جبکہ فقہ سے مخالفت نہیں کی جو اصولی و اخباری دونوں گروہوں میں مشترک ہے ۔ وہ اصولی روش کے بجائے اخباری روش کے ذریعہ فقہ تک پہنچنا چاہتا ہے

تہذیب نفس کی راہ

بہر حال جس راہ کو یہ اعتراض کرنے والے تسلیم کرتے ہیں ، ان ہی تک منحصر نہیں ہے ، بلکہ اس راہ سے اسلام سے قبل سقراط اور اسلام کے بعد شیخ اشراق اور ان کے ہم فکر افراد بھی گزرے ہیں اور اس موضوع پر انہوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہم ان معترضین سے کہتے ہیں کہ اگر آپ تہذیب نفس کرنا چاہتے ہیں اور اس راہ میں مدتوں ریاضت کے بعد اس کا کچھ ثمرہ حاصل کرتے ہیں اور پھر آپ اسے رشتۂ قلم میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو آپ کی تحریر منطقی بنیاد پر استوار ہونا چاہیئے اور آپ کے پاس ایک عقلی پیمانہ اور میزان ہونا چاہیئے جس سے آپ سمجھ سکیں کہ جو کچھ آپ نے حاصل کیا ہے حق ہے یا نہیں ؟ اور یہ بات ہر شخص پر صادق آتی ہے ، سوائے اس شخص کے جو خود ہی میزان ہو ۔ اور اس منزل پر صرف معصومین علیہم السلام فائز ہیں کیونکہ معصوم بذات خود "صراط" ہے ، اس کے یہاں باطل یا شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ وہ خود میزان اور حق ہے اور جہاں حق ہی حق ہو ۔ شک کی گنجائش ہی نہیں ہے ۔

مثال کے طور پر : اگر ہمارے پاس ایک ایسا کتب خانہ ہو جس میں تفسیر کے علاوہ کسی اور موضوع کی کتاب موجود نہ ہو ، تو ہم کسی کتاب کے بارے میں شک نہیں کریں گے کہ یہ تفسیر کی کتاب ہے یا حدیث کی ، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ تفسیر کی کتاب ہے اس لئے کہ اس کتب خانہ میں سوائے تفسیر کے کوئی دوسری کتاب ہے ہی نہیں ، لیکن اگر کسی کتب خانہ میں تفسیر کی کتاب بھی ہو اور حدیث کی بھی تو پھر کتاب کے سلسلہ میں دو احتمال پایا جائے گا ۔ اس لئے یہاں شک کی گنجائش موجود ہے ۔

پس جس دائرہ میں حق کے علاوہ کچھ اور نہ ہو، قہری طور پر وہاں وسوسہ، باطل یا شیطنت کا گزر ہی نہ ہوگا، وہاں صرف عصمت کا بلند مقام ہے اور بس۔ لیکن جو لوگ اس درجہ پر فائز نہیں ہوئے لیکن انہوں نے تزکیۂ نفس کے ذریعہ ایک باعظمت مقام حاصل کر لیا ہے وہ بلا شبہ صرف خود کو مطمئن کرنا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں تک حق پہنچانے کے بھی درپے رہتے ہیں، یہی وہ منزل ہے جہاں اسی کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں کہ دوسروں کو سمجھانے کے لئے ایک آلہ یا میزان بروئے کار لائیں۔

بنابرایں جس راہ کے لئے کہا گیا ہے کہ ہمیں کتاب و سنت کی روش اپنانا چاہیئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ: اگر انسان نفسانی ہوا و ہوس سے دور رہے اور اخلاقی رذائل و برائیوں سے خود کو پاک و پاکیزہ رکھے نیز روحانی فضائل اور اچھائیاں اپنے اندر پیدا کرے تو بہت سے مسائل اس پر روشن و واضح ہو جاتے ہیں اور یہ وہ دوسرا مرحلہ ہے جسے تزکیہ کہتے ہیں اور جسے انشاء اللہ آئندہ بیان کیا جائے گا یہی وہ راہ تھی جسے بعض یونانی فلسفیوں، اسلامی فلاسفہ اور حتی مغربی فلاسفہ نے بھی طے کیا ہے اور اس کی تائید کرتے ہیں۔ اگرچہ اس معنی و مطلب کی توجیہ و تشریح ہر گروہ اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے۔ مثلاً افلاطون کے پیرووں کا بعض شواہد کی روشنی میں، خیال تھا کہ چونکہ روحیں، جسموں سے پہلے خلق ہوئی ہیں لہٰذا تمام ضروری علوم فطرت اولیہ کی بنیاد پر خود انسان کے اندر ذخیرہ کر دیئے گئے ہیں اور جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کی پوری کوشش یہی رہتی ہے کہ نسیان اور فراموشی کے پردے چھٹ جائیں اور وہ ذخیرہ شدہ علوم ظاہر ہو جائیں۔ اس طرح وہ علوم جو بالفعل انسان کی فطرت اور نہاد میں پوشیدہ تھے غفلت کے ان پردوں سے گرد و غبار کے صاف ہو جانے کے بعد اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

اسلامی فلاسفہ کا استدلال

اسلامی حکما میں بھی جن لوگوں نے افلاطونی روش کو تسلیم کیا ہے، اکثر انہوں نے اس آیت "وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ..." (اور انھیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا۔ سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۷۲) سے تمسک کرتے ہوئے ان روایتوں سے استدلال کیا ہے، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ارواح جسموں سے ہزار یا ہزاروں سال قبل پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے علوم جو انسان کی

سعادت و خوش بختی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، فطری طور پر انسان کی روح میں پوشیدہ ہیں اور انسان کو اس کی جسمانی و مادی سرگرمیوں اور تعلقات و روابط نے ان سے غافل بنا دیا ہے۔ اسے چاہئے کہ تزکیہ و تہذیب نفس کے ذریعہ نفس اس غفلت و فراموشی کو دور کرے تاکہ وہ باطنی علوم اس پر ظاہر ہو جائیں۔

ایک دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ تمام علوم انسان کے باطن میں موجود ہیں اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ تزکیہ اس لئے ہے کہ انسان اس صفحۂ روح کو آئینہ کی مانند شفاف رکھے کیونکہ اس صورت میں کہ عالم کے اسرار و رموز آئینۂ روح میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان مکمل طور سے کائنات کی معرفت حاصل کرلے گا۔ یہ انداز فکر، ہمیں فلسفۂ اشراق، مولانا روم کے اشعار اور ملا محسن فیض کاشانی کی "المحجۃ البیضاء" میں نظر آتا ہے۔

انسان میں اسرار عالم کی تابشیں

مثلاً ایک داستان جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے اور مولانا روم کی مثنوی نیز محجۃ البیضاء دونوں میں موجود ہے، کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص نے اپنے محل میں تزئین و نقاشی کرانا چاہی۔ اس نے اس کام کے لئے دو گروہوں کو بلایا تاکہ دیکھے کہ ان میں سے کس کا ہنر اچھا ہے۔ اس نے ایک ہی کمرہ کی دو دیواریں جو ایک دوسرے کے مقابل تھیں دونوں گروہوں کے حوالے کیں اور ان سے نقاشی کرنے کو کہا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کس گروہ کی فن کاری بہتر ہے تاکہ پورا محل نقاشی کے لئے اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

پہلے گروہ نے نقاشی کے لئے طرح طرح کے رنگ اور دوسرے وسائل طلب کئے اور اپنی پوری کوشش اس پر صرف کی کہ دیوار پر مکمل طور سے بہترین گل کاری کرے۔ دوسرے گروہ نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا، اور کوئی ان کے کام کے راز سے بھی واقف نہ تھا لیکن یہ گروہ بھی اپنی کوشش میں مشغول تھا۔ مقررہ دن پر جب یہ طے تھا کہ دونوں گروہوں کی نقاشی کا معاینہ کیا جائے گا، لوگوں نے دیکھا کہ پہلے گروہ نے دیوار پر بڑی خوبصورت اور دلکش گل کاری کی ہے اور بہترین نقش و نگار منقش کئے ہیں لیکن دوسرے گروہ کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ اس مدت میں دیوار کو آئینہ کی مانند صاف و شفاف کر دے

جب پردہ سامنے سے ہٹایا گیا تو پہلے گروہ کی تمام محنتیں اور کوششیں سامنے والی دیوار میں منعکس ہوگئیں

اس داستان کے نقل سے ملا محسن فیض اور دوسرے افراد کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی کوشش و ریاضت کے ذریعہ اپنے باطن اور اپنی روح کو آئینہ کی مانند شفاف بنا ڈالے تو اسرار کائنات اس میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ تزکیہ و تہذیب نفس اسی لئے ہے کہ انسان اخلاق رذیلہ اور برائیوں سے بھی پاک ہوجائے اور اخلاق حسنہ سے اپنے نفس کو جلا بخشنے کی کوشش بھی کرے تاکہ وہ اسرار عالم کا آئینہ خانہ بن سکے۔

اس راہ کو نہ صرف شیخ الاشراق نے اپنایا ہے بلکہ محقق طوسی خواجہ نصیر الدین نے بھی اس روش پر کچھ کاوشیں فرمائی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روش فلسفہ سے ٹکراؤ نہیں رکھتی، لیکن جو بات یہاں قابل ذکر ہے، یہ ہے کہ اگر کسی نے اس راہ کو طے کیا تو آخر ایک نہ ایک روز وہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ بیان کرے گا یا قلم اٹھائے گا۔ اگر اس نے کچھ لکھنا چاہا تو کم از کم اس میں بہر حال اتنی قوت و صلاحیت ہونا چاہیئے کہ اپنے علم حضوری کو حصول کی کیفیت میں ڈھال سکے اور اس علم حضوری سے منکشف ہونے والی معلومات کو علم حصولی کے ذریعہ ثابت کرسکے۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو علم حضوری تو رکھتے ہیں، لیکن اس کی ترجمانی کی منزل میں یا اسے علم حصولی میں تبدیل کرنے کے مرحلہ میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

شرع کے ذریعہ تزکیۂ نفس

ممکن ہے معترضین یہ کہیں، کہ تزکیۂ نفس شرع کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اتفاق سے عرفائے اسلامی نے آپ سے پہلے یہ شرط معین کر رکھی ہے اور ان کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔

نمونہ کے طور پر، چند صدی قبل کے ایک عظیم عارف سید حیدر آملی (رہ) فرماتے ہیں: راہِ شرع کے علاوہ کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اور اگر کہیں وہ شریعت کو "قشر" یا چھلکے سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت پوست یا چھلکا ہے اور طریقت مغز یا گودا۔ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اس کی محافظ ہے میوے یا پھل کی حفاظت پوست یا چھلکا کرتا ہے۔

حضورِ قلب نماز کی حفاظت کرتا ہے۔ پس اگر نماز نہ ہو تو حضورِ قلب ہی نہیں ہے، یعنی "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (طٰہٰ، آیت نمبر ۱۴) "نماز کو ہماری یاد کے لئے قائم کرو"، ہی کی منزل نہیں ہے۔ اگر کوئی حضورِ قلب نہ رکھتا ہو تب بھی تمام فقہاء اپنے رسالۂ عملیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کی نماز صحیح ہے لیکن وہ قبولیت جو حضورِ قلب کے ساتھ ہے اس صورت میں نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں: صحت، شریعت ہے اور قبولیت، طریقت۔ چنانچہ فاسق کی نماز بھی صحیح ہے لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس کی نماز مقبول بھی ہے "اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ" (المائدہ/۲۷) "خداوندِ عالم صرف صاحبانِ تقویٰ کا عمل قبول کرتا ہے"۔

پس یہ شرط جو اعتراض کرنے والے معین کر رہے ہیں، کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ان معترضین سے پہلے عرفائے اسلامی نے بھی یہی شرط قائم کی ہے۔ سید حیدر آملی مرحوم اپنی کتاب "جامع الاسرار" میں فرماتے ہیں: جو کچھ وحی کی شکل میں نازل ہوا ہے اس سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو کچھ وحی نے بیان کیا ہے کیا یہی ظاہری معنی ہے یا کچھ باطنی معنی بھی ہے؟ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک نکتہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ابوالقاسم کے معنی

شیخ صدوق اپنی کتاب "معانی الاخبار" میں ایک حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: امام رضا علیہ السلام کا ایک شاگرد کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے سوال کیا کہ: رسولِ خداؐ کو "ابوالقاسم" کیوں کہتے ہیں؟

فرمایا: اس لئے کہ خداوندِ عالم نے آنحضرتؐ کو قاسم نام کا ایک فرزند عطا فرمایا، اور حضرتؐ قاسم کے پدرِ بزرگوار تھے، اس لئے آپ کو ابوالقاسم کہتے ہیں۔

میں نے عرض کی: کیا میں اس کا اہل ہوں کہ آپ میرے لئے اس مطلب کی مزید وضاحت فرمائیں؟

فرمایا: ہاں! کیا ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہؐ نے علی بن ابیطالبؑ کی تربیت کی ہے اور انھیں اپنے سایۂ مبارک میں پروان چڑھایا ہے؟ عرض کی: ہاں۔

فرمایا: کیا علیؑ "قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃِ" نہیں ہیں؟ عرض کی: ہاں ہیں۔

فرمایا: علی بن ابی طالبؑ کی تربیت رسول اللہؐ نے فرمائی تھی (اصل اول) اور علی بن ابیطالبؑ قسیم الجنۃ والنار ہیں (اصل دوم) اور چونکہ معلم، شاگرد کے لئے باپ کے برابر ہوتا ہے (اصل سوم) لہٰذا رسول اللہؐ ابوالقاسم ہیں۔ (۱)

اس طرح کے بہت سے لطائف ہماری روایات میں پائے جاتے ہیں اور عرفا ان مسائل کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ یہ حدیث شریف میں نے پہلی مرتبہ استاذ مرحوم شیخ محمد تقی آملی رضوان اللہ علیہ کے درس میں سنی تھی۔ آپ نے فرمایا: کاش اس راوی کا ظرف علم لبریز نہ ہوا ہوتا اور وہ حضرتؑ سے پھر اس کی مزید وضاحت دریافت کرتا، تاکہ ہم سمجھتے کہ حضرت اور کیا بیان فرماتے ہیں۔

شیخ صدوق نقل کرتے ہیں کہ زرارہ نے چھٹے امام (ع) سے دریافت کیا: کیا خداوند عالم قیامت میں دکھائی دے گا؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: کیا تم آج خدا کو نہیں دیکھتے! عرض کی: میں یہ روایت آپ سے نقل کر دوں؟

فرمایا: نہیں! تم نے اگر یہ حدیث مجھ سے نقل کی تو لوگ یہ خیال کریں گے کہ ان ہی آنکھوں سے خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جبکہ "لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" (الانعام/۱۰۳) "نگاہیں اسے نہیں دیکھتیں اور وہ نگاہوں کو دیکھتا ہے"

حضرت اپنے نابینا صحابی، ابو بصیر سے بھی فرماتے ہیں:

تم اس حالت میں بھی، اس وقت بھی خدا کو دیکھ سکتے ہو۔ یہ وہی روایت ہے جس میں قلب کے ذریعہ اور حقیقت ایمان کے ساتھ واقعیت کو دیکھا جا سکتا ہے، ان ظاہری نگاہوں سے نہیں۔ بنابرایں، راہ دراصل دو نہیں ہے کہ ایک کو شریعت کہا جائے اور دوسری کو طریقت۔ بلکہ راہ ایک ہی ہے اور وہی علیؑ اور اولادِ علیؑ کی راہ ہے۔ لیکن ہمارے بعض بزرگ اور عرفا، خصوصاً سید حیدر آملی مرحوم اس راہ کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ طے کرتے نظر آتے ہیں۔

باقی آئندہ

بشکریہ پاسدار اسلام

۱۔ معانی الاخبار ص ۵۲

قال الحجة بن الحسن علیہ السلام

قلوبنا اوعیة لمشیة الله

فاذا شاء شئنا

ہمارے قلب مشیت پروردگار کا ظرف ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ پس ☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جب خدا نے چاہا تو ہم نے بھی چاہا

بحار الانوار / ج ۵۲ / ص ۵۱

معاد

انبیاء اولیاء اور حکماء کی نظر میں

تحریر: آیۃ اللہ شیخ حسین نوری
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی دنیا کے عظیم فلسفی "صدر المتألہین" شیرازی اپنی کتاب میں، جو انھوں نے "مبدأ و معاد" کے نام سے تالیف فرمائی ہے، فرماتے ہیں: معاد کے موضوع پر ایمان و اعتقاد تمام ادیان اور شریعتوں کی بنیاد و اساس ہے، دنیا کے تمام ادیان کی عمارتیں اسی ستون پر قائم کی گئی ہیں اس مسئلہ پر تمام صاحبان ادیان و شریعت کا اتفاق ہے چنانچہ اقوام عالم میں کوئی قوم ایسی نہیں مل سکتی جن کے درمیان آخرت اور دوسری دنیا میں ثواب و عقاب اور اعمال کی جزا و سزا کے تحت وعدہ وعید سے کام نہ لیا گیا ہو۔

اس اتفاق نظر اور وحدت عقیدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اپنی شریعتیں "مبدأ و معاد" یعنی خدا اور آخرت کی بنیاد پر کہ جس کا انسانوں کی فطرت خود تقاضا کرتی ہے استوار کی ہیں۔

انبیائے الٰہی کی روشن و تابناک اور متفق و مسلّم تاریخ بھی واضح طور پر اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ خدا کے عظیم پیغمبروں مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تاریخ زندگی کا مطالعہ کریں، جو سراسر رنج و درد و مصیبت سے مملو نظر آتی ہے، اور ان حضرات

کی تعلیمات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ حضرات اس دنیا کی زندگی کو ایک دوسری دنیا کی زندگی کے لئے مقدمہ خیال کرتے تھے۔ اس دنیا اور اس کی زندگی کو اُس دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس دنیا کی نعمتوں تک پہنچنے اور جوارِ قربِ الٰہی سے بہرہ ور ہونے کے اشتیاق میں گھڑیاں شمار کیا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ جنھوں نے اپنی پوری زندگی وقت کے طاغوتوں یعنی نمرود اور نمرودیوں سے مقابلہ میں بسر کی اور اس راہ میں بے پناہ مصیبتیں برداشت کیں آخر خداوند عالم سے خواہش کرتے ہیں

"وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ" (شعراء/۸۵)

پروردگارا مجھ کو نعمتوں سے معمور بہشت کے وارثوں میں قرار دے۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام جو کنویں میں ڈالے جانے اور پھر برسوں قید خانے کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد مصر کی حکومت پر قابض ہوئے اور دنیا بھر کی نعمتیں آپ کے اختیار میں آگئیں پھر بھی وہ ان تمام نعمتوں کو آخرت کی تمام نہ ہونے والی نعمت اور جوار رحمت حق سے قربت کے مقابلہ میں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، کسی وقت بھی آپ کی پُر عظمت روح اس قسم کی زرق برق اور آسائش و آرام کے وسائل دیکھ کر قانع نہ ہوئی بلکہ آپ نے گریہ وزاری کے ساتھ خداوند عالم سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے یوں تقاضا کیا کہ:۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ (یوسف/۱۰۱)

پروردگار! تو نے مجھے سلطنت و عزت عطا کی اور عالم رؤیا کا علم دے کر مجھے خواب کی تعبیر دینا سکھایا تو ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور تو ہی میرا ولی نعمت اور دنیا و آخرت میں میرا محبوب ہے مجھے اس عالم میں اٹھا کہ تیرے حضور یہ سر تسلیم خم رہے اور مجھے اپنے صالح بندوں کے ساتھ محشور فرما۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسلام کی تاسیس و تبلیغ کی راہ میں بہت زیادہ مصیبتیں برداشت کیں انھیں اپنے زمانے کے طاغوتوں سے نبرد آزما ہونے کی بنا پر سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا

اسلامی اہداف و مقاصد کی راہ میں، مقدمہ کے طور پر دسیوں جنگیں لڑنا پڑیں، خون بہے، بے پناہ جان و مال کی قربانیاں پیش کیں اور جب اس دنیا سے رخت سفر باندھنے کا وقت آپہنچا تو اپنے دوستوں سے فرمایا

"ستردون علیّ الحوض" تم لوگ جلد ہی حوض کے کنارے مجھ سے ملحق ہو گے میں وہاں تمہارا منتظر رہوں گا۔

خدا کے مخصوص و مقرب اولیائے کرام یعنی اہلبیت پیغمبر علیہم السلام بھی اسی عقیدہ کی بنیاد پر زندگی بھر رنج و مصیبت اٹھاتے رہے قید خانوں کی تنہائی اور صعوبتیں برداشت کیں، دشوار گزار مرحلوں سے گزرتے رہے اور نیزہ و شمشیر کا استقبال کیا اور نہایت ہی اشتیاق و شادمانی کے ساتھ خود کو قتل ہونے اور ٹکڑے ٹکڑے کئے جانے کے لئے قربان گاہ الفت میں پیش کرتے رہے یہ حضرات زخموں کے کرب بھوک و پیاس اور صدموں پہ صدمے برداشت کرتے ہوئے زندگی کی آخری سانسوں تک صبر و استقامت کے جوہر دکھاتے اور ہنستے ہنستے موت کا استقبال کرتے اور اس کو اس دنیا سے ایک وسیع تر دنیا کی طرف پیش قدمی اور بارگاہ مقدس الہٰی میں حاضری و تقرب الہٰی کا وسیلہ و ذریعہ سمجھتے رہے۔

بڑے بڑے الہٰی فلسفیوں نے بھی اسی عقیدہ کی بنیاد پر دنیوی زندگی کو حقیر و ناچیز شمار کیا ہے وہ اپنی پوری زندگی کے دوران نفوس کی پاکیزگی، انسانی اخلاق و معارف کی تکمیل اور عوام کی تربیت و نصیحت کے علاوہ اس زندگی کا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں سمجھتے تھے۔

ارسطو، افلاطون، سقراط اور فیثا غورث کی زندگی اور موت کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے لطیف نکتے سامنے آئیں گے جو سب کے سب معاد اور اخروی زندگی پران فلاسفہ کے یقین و اعتقاد کی حکایت کرتے ہیں۔

الہٰی حکماء و فلاسفہ نے ہمیشہ اپنی تعبیرات و اصطلاحات میں اس بدن کو روح کے لئے ایک قید خانے اور جسم سے روح نکل جانے کو قفس عنصری سے طائر روح کے آزاد ہو جانے سے تعبیر کیا ہے یا انھوں نے "انسانی بدن" کو ایک انڈے اور روح کو مرغی کے ایک چوزے سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے کامل ہونے کے بعد انڈے کی کھوکھلائی ٹوٹ جاتی ہے اور چوزہ باہر نکل آتا ہے یا یہ کہ دنیا کو "رحم مادر" اور روح کو جنین سے تعبیر کیا ہے جو رحم مادر میں تخلیقی مراحل طے کرتا ہے اور پھر کامل اور اس

دنیا کے لئے ضروری وسائل سے لیس ہو کر جب دنیا میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے رحم مادر سے باہر نکل آتا ہے اور اس وسیع و روشن دنیا میں زندگی شروع کر دیتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان اس رحم دنیا میں اپنی تعمیری منزلوں سے گزرتا ہے اور جس وقت اس (اخروی) دنیا کے لائق لوازمات زندگی سے لیس ہو جاتا ہے تو بڑے ہی شوق و اشتیاق کے ساتھ اس "رحم دنیا" سے نکل کر ایک دوسری دنیا میں جو اس سے بھی زیادہ وسیع و روشن ہے داخل ہو جاتا ہے۔ ان حکماء نے دراصل موت کو ایک ایسے انسان کے لئے جو کمال کی منزلیں طے کر چکا ہے، "دوسری زندگی" قرار دیا ہے۔ (۱)

صاحب "مبدأ و معاد" اس کے بعد فرماتے ہیں: "موت کے بعد بقائے روح" کی دلیلوں میں سے ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ انسان خواب میں اپنے ماں باپ یا کسی دوسرے آشنا کو ان کے مرنے کے بعد دیکھتا ہے اور ان سے مختلف موضوعات کے سلسلہ میں سوالات کرتا ہے اور وہ لوگ بالکل صحیح جواب دیتے ہیں چنانچہ مرنے والے کی اولاد و رشتہ دار اگر کوئی چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انھیں ڈھونڈنے سے نہیں مل پاتی تو یہ مرنے والے خواب میں اس چیز کی نشان دہی کر دیتے ہیں اور یہ رہنمائیاں سو فی صد درست اور واقعہ کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں۔

تقریباً ہر شخص نے اپنی زندگی میں اس طرح کے خواب دیکھے ہوں گے، ظاہر ہے مادیت یا مادی بنیادوں پر استوار طرز فکر میں جہاں روح کے وجود سے ہی انکار پایا جاتا ہے اور جن کے نزدیک موت کے بعد روح کی بقا کا تصور محال ہے، اس قسم کے خوابوں کی کوئی تفسیر و توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

تاریخ میں ملتا ہے کہ فردوسی نے جب سلطان محمود کی خواہش پر "شاہنامہ" نظم کیا اور اس کی تکمیل کے بعد سلطان محمود نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور فردوسی کی محنت کا پھل اس کو نہ ملا تو وہ بہت ہی ناراض اور آزردہ خاطر ہوا رستم اس کے خواب میں آیا اور اس سے کہا: تم نے اس کتاب میں متعدد مقامات پر میری تعریف کی ہے اور میں اگرچہ اس وقت مُردوں کے زمرہ میں داخل ہوں اور تمہارے حق کی ادائیگی کی قوت نہیں رکھتا لیکن فلاں جگہ ایک دفینہ موجود ہے تم کل جا کر اس جگہ کو کھود کر حاصل شدہ خزانہ اپنے کام میں لاؤ، فردوسی خواب سے بیدار ہونے کے بعد، جو نشانیاں خواب میں اس سے بیان کی گئی تھیں اس کے مطابق مذکورہ مقام تک

۱۔ مبدا و معاد ص ۲۳۱ - ۲۳۴

پہنچا، کھدائی کی اور اس کو خزانہ حاصل ہو گیا اور اس نے اس کو اپنی ضروریات میں صرف کیا۔ لہٰذا وہ برابر کہا کرتا تھا: "رستم اپنی موت کے بعد بھی سلطان محمود سے کہ جو زندہ ہے، زیادہ سخی و کریم ہے۔"(۱)

حکیم بزرگ ملاصدرا شیرازی کی تقریر میں اس نکتہ سے متعلق کہ الٰہی فلاسفہ، اُخروی دنیا کے بارے میں اپنے محکم اعتقاد کے نتیجہ میں اس دنیا اور اس کے مظاہر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے دل اس سے نہیں لگاتے تھے، حکیم سقراط کی تاریخ زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ اس منزل میں اس عظیم فلسفی کی حیات کے بارے میں جس نے حضرت عیسیٰ مسیحؑ سے قبل پانچویں صدی کے آخر میں زندگی گزاری اور عقیدۂ معاد پر راسخ یقین جس کی حیات و موت کا اصلی پایہ و اساس تھا، مختصر طور پر توضیح دے دینا مناسب معلوم دیتا ہے۔

سقراط کو حکماء کا امام اور فلاسفہ کا استاد مانتے ہیں اور چونکہ اس نے بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت اور اپنے زمانے کے ظالموں، جابروں اور طاغوتوں کے خلاف نبرد آزمائی کی راہ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی ہے اس لئے اس کو عالم انسانیت کے عظیم شہداء میں شمار کرتے ہیں۔

کہتے ہیں: "سقراط وہ شخص ہے جو فلسفہ کو آسمان سے زمین پر لے آیا" اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل نوعی طور پر علم فلسفہ کی بنیاد کا آغاز وجود انسانی سے باہر کی دنیا سے کرتے تھے، لیکن اس نے اپنی تعلیمات کا خود انسانی وجود سے آغاز کیا اور اپنے عہد کے لوگوں کو تاکید کی کہ حقائق عالم کی شناخت و معرفت کے لئے بلند پروازی کو بالائے طاق رکھ کر خود اپنے وجود میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو سمجھیں، سنواریں اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو صحیح طور پر تشخیص دیں۔

وہ کہا کرتا تھا، میرے پاس علم نہیں ہے کہ میں اس کی تعلیم دوں بلکہ اپنی ماں کی طرح "دائی گیری کے فن" (زچگی کے امور) سے واقف ہوں (سقراط کی ماں قابلہ "دائی" تھی۔) جس طرح دائی بچے کی ولادت میں مدد کرتی ہے میں نفوس کو وجود حاصل کرنے میں مدد پہنچاتا ہوں یعنی: "وہ آپے میں آئیں اور حصول معرفت کی راہ کو پہچان لیں، صحیح معرفت خود تمہاری

۱۔ مبدا و معاد ص ۲۳۴-۲۳۵۔

اپنی شناخت سے پیدا ہوتی ہے ۔

وہ بد عمل اور غلط امور کے ارتکاب کی اصل وجہ اشتباہ و نادانی کو قرار دیتا تھا وہ کہا کرتا تھا اگر عوام خیر و نیکی کو اچھی طرح درک کریں اور اس کی تمیز کا سلیقہ پیدا ہو جائے اور شر کو بھی کامل طور پر مشخص کرنے لگیں تو ہرگز شر کی راہوں میں قدم نہیں بڑھا سکتے اور نیک امور کی انجام دہی سے دوری اختیار نہیں کر سکتے ۔

وہ کہتا تھا : انسان قدرتی طور پر خوشی و نیکی کی تلاش میں رہتا ہے لیکن یہ انسانی سعادت و نیکی لذت و شہوت کے حصول سے فراہم نہیں ہو سکتی بلکہ سعادت و خوش بختی تک پہنچنے کی راہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالینا ہے ۔ افراد کی سعادت و خوش بختی بھی معاشرہ کی سعادت میں مضمر ہوتی ہے ۔ حکیم سقراط سے بہت زیادہ حکمت آمیز کلمات نقل ہوئے ہیں ۔

اور بالآخر جس زمانے میں سوفسطائیوں کے نام سے بہت سے گروہ ، جو اس دنیا کی تمام چیزوں کو محض "خیال" تصور کرتے تھے حقائق عالم کا کلی طور پر انکار کر دیا تھا اور خدا کے عنوان سے بتوں کی پرستش کرتے تھے ، پورا معاشرہ جابروں کے ظلم و جور اور اخلاقی فساد کی لپیٹ میں تھا حکیم سقراط نے ان انحرافات کے خلاف آواز اٹھائی طاقت فرسا زحمتوں اور بے پناہ کوششوں کے بعد لوگوں کی فکر اور معاشرے کی صورت حال میں تبدیلی پیدا کی ، گمراہی اور سرکشی کی راہیں بند کیں لیکن ارباب زر و زور ، گندی سیاست کے کھلاڑی ، جن کو اپنی منفعت خطرے میں نظر آ رہی تھی ، عداوت و حسد کے شعلے ان کے سینوں میں بھڑک اٹھے اور آخر کار اس کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور خود ساختہ الزام کی بنیاد پر مقدمہ چلا کر اس کو قتل کی سزا سنا دی گئی

جس دن اس کو زہر کے ذریعہ قتل کیا جانا تھا اس کے شاگرد جن کی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار تک پہنچتی تھی ، اپنے عظیم استاد سے ملنے کے لئے قید خانے میں ملنے آئے استاد نے جس کے چہرے سے مکمل طور پر کیف و نشاط کے آثار ہویدا تھے اور جو اس کی روحانی عظمت کی نشاندہی کر رہے تھے مسکراتے ہوئے شاگردوں کا استقبال کیا ، شاگردوں نے بھی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بہت سے علمی سوالات پیش کئے جن کے جوابات استاد نے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیئے ۔ اس عزم و استقامت اور موت کو کوئی اہمیت نہ دینے پر سب کے سب حیران و

متعجب تھے، اس وقت ایک شاگرد جس کا نام سیمیاس تھا استاد سے مخاطب ہوا: استاد! میں ایک سوال اور کرنا چاہتا تھا لیکن ڈرتا ہوں شاید آپ کی موجودہ حالت اس کا جواب دینے کے لئے مساعد نہ ہو، سقراط نے کہا، میری روحانی کیفیت میں موجودہ صورت حال سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ میں اب جبکہ خود کو شہادت سے اتنا قریب پا رہا ہوں زیادہ خوش حال ہوں کیونکہ اگرچہ میں تمہارے جیسے شریف و وفادار دوستوں سے جدا ہو رہا ہوں لیکن آج اپنے باافضل و باشرف بھائیوں کی خدمت میں، جو اس دنیا میں منتقل ہو چکے ہیں، پہنچ جاؤں گا، اس کے بعد اس علمی سوال کا بھی جواب دے دیا پھر اپنی جگہ سے یہ مرد عظیم اٹھا بدن کی طہارت بجا لایا اور خدا کی راہ میں شہادت کا جام نوش کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور بڑی ہی کشادہ روئی اور طمأنینت قلب کے ساتھ زبان پر یہ فقرے جاری کئے:۔

"اسلمتُ نفسی الیٰ قابض ارواح الحکماء"

میں نے اپنی جان اس کے حوالے کی جو حکیموں کی روحیں قبض کرتا ہے۔ (۱)

۱۔ "یورپ میں حکمت کا ارتقا" (سیر حکمت در اروپا) جلد اوّل ص ۳۰۲، دائرۃ المعارف للقرن العشرین مادہ س، "ناسخ التواریخ جلد اول ص ۱۴۷۔

قالَ علی علیہِ السلام

مِسۡکِینُ ابۡنُ آدَمَ!:
مَکۡتُومُ الۡاَجَلِ ، مَکۡنُونُ الۡعِلَلِ ،
مَحۡفُوظُ الۡعَمَلِ ، تُؤۡلِمُہُ الۡبَقَّۃُ
وَتَقۡتُلُہُ الشَّرۡقَۃُ وَتُنۡتِنُہُ الۡعَرۡقَۃُ

نہج البلاغہ / نصیحت / ۴۱۹

آدمی کتنا بے چارہ اور بے بس ہے ۔ اس کی موت اس سے پوشیدہ ہے ، بیماریاں اس سے چھپی ہوئی ہیں اور اس کے اعمال محفوظ ہیں ، کھٹمل اسے اذیت پہنچا دیتا ہے ۔ اُچھو اسے مار ڈالتا ہے اور پسینہ اسے بدبودار بنا دیتا ہے

معارف قرآن

قرآن

عظیم ترین الٰہی تحفہ

جناب استاد محمد تقی مصباح یزدی

ترجمہ: سید ولی الحسن رضوی

قرآن کریم، خداوند عالم کی جانب سے انسانوں کے لئے عظیم ترین تحفہ ہے جو سعادت جاودانی کی طرف ان کی ہدایت کرتا ہے۔

قرآن مجید، اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کی حقانیت پر بہترین دلیل ہے جو ہمیشہ اپنے اعجاز آفریں بیان سے تمام انسانوں کے لئے حجت تمام کر دیتا ہے۔

قرآن حکیم، اسلامی احکام و معارف کے اثبات کی معتبر ترین سند ہے خداوند متعال نے جس کی بقا کی ضمانت لی ہے۔ اور ہر طرح کی تحریف سے اس کو محفوظ و مصون رکھا ہے۔

قرآن شریف، تمام مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا محکم ترین محور ہے جس میں تمام فرقوں اور گروہوں کے درمیان اختلافات مٹانے کا منبع و وسیلہ بننے اور تمام حق کے متلاشیوں کے سامنے دین کے اصل خطوط واضح کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ان سب کے باوجود مسلمانوں نے حقائق کی شناخت اور اس کے اصول و قوانین کی اطاعت کے سلسلہ میں ضروری اہتمام سے کام نہیں لیا ہے اسی بنا پر رحمت الٰہی کا پیغام لانے والا بارگاہ پروردگار میں شکایت کرتا نظر آتا ہے:۔

"وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا"

(اور رسولؐ نے کہا، اے میرے پالنے والے! بے شک میری اس قوم نے اس قرآن کو مہجور و تنہا چھوڑ دیا ہے)۔ فرقان / ۳۰

ہمارے عصر کی جلیل القدر ہستی علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ نے حوزۂ علمیہ قم میں قرآن کے احیار کا پرچم بلند کیا اور اپنے دروس نیز "المیزان" جیسی تفسیر لکھ کر اس راہ میں ایک عظیم قدم اٹھایا کہ انشاء اللہ خداوند عالم انہیں اس کا اجر عطا کرے گا اس جذبہ سے سرشار ہو کر ہم نے قرآنی افکار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کے مطالب کو چند عنوانات کے تحت جدید پیرائے میں اختصار کے ساتھ درس کے عنوان سے رواں و عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

• • •

جیسا کہ امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ قرآن ایک بے کراں سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک پہنچنا معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے اس کے باوجود خود قرآن نے بھی اور حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بھی لوگوں کو قرآنی آیات کے بارے میں غور و فکر سے کام لینے کی دعوت دی ہے قرآن کہتا ہے:-

"کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ" (سورۂ ص آیت ۲۹)

ہم نے برکتوں سے معمور کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں۔

قرآن اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ لوگ جو قرآن میں فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے ان کو مورد مواخذہ قرار دیتا ہے:-

"افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا" (سورہ محمد آیت: ۲۴)

آیا وہ قرآن کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟

پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے بھی قرآن کی طرف رجوع کرنے اور اس کی آیتوں پر غور و فکر کرنے کی بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی ہے۔ خصوصاً جبکہ معاشرہ کی فکر ظلمت و آشفتگی کا شکار ہو اور مسلمانوں کے درمیان ایسے شکوک و شبہات سر ابھار رہے ہوں جو ان کو فکری و عقیدتی انحرافات میں مبتلا کرنے کا سبب ہوں تو ایسے حالات میں قرآن کی طرف

رجوع کرنے کی شدید لہجہ میں تاکید کی گئی ہے :۔

"اِذَا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن"

(اصول کافی جلد ۲ ص ۴۳۸)

جب فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی مانند تم کو گھیر لیں تو قرآن کی جانب رجوع کرو

اگرچہ بہت سی روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کا کامل علم محض پیغمبر اسلام اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کے پاس ہے اور وہی قرآن کے حقیقی معلم و مفسر ہیں [جیسا کہ پیغمبر اکرم کے بارے میں قرآن کہتا ہے : قرآن کے معلّم اور اس کو بیان کرنے والے خود پیغمبر اسلام ہیں] (۱) اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خود نبی اکرم اور ائمہ اطہار نے بھی قرآن کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی ہے حتیٰ فرمایا ہے : اگر ہم سے منقول روایات کے بارے میں شک پیدا ہو تو انھیں قرآن کی روشنی میں پرکھ لو"

(۱۔ پیغمبر اسلام کے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ خداوند عالم آپ کے بارے میں : "یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم" کے بعد فرماتا ہے : "ویعلمهم الکتاب والحکمة" (سورہ جمعہ آیت : ۲) یعنی تلاوت اور لوگوں کا تزکیہ کرنے کے بعد تعلیم قرآن کی نوبت آتی ہے معلوم ہوا قرآن کی تعلیم آیات کی تلاوت سے الگ ایک چیز ہے لہٰذا پیغمبر کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ جب آپ پر قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں تو آپ لوگوں کے سامنے ان آیات کی تلاوت فرماتے تھے تاکہ لوگ قرآن کے الفاظ یاد کر لیں اور اس کے بعد نبی اکرم تزکیہ نفس فرماتے تھے ، اور پھر نبی کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور یہ تعلیم محض قرآن کے الفاظ دہرانا نہیں ہے کیونکہ یہ تو وہی تلاوت قرآن ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کے مطالب و مفاہیم سے عوام کو آگاہ کریں ، یعنی جو چیزیں لوگ خود سمجھنے سے قاصر ہیں اس کا سمجھانا نبی کی ذمہ داری ہے چنانچہ قرآن میں بھی یہ وضاحت موجود ہے : "یعلمکم ما لم تکونوا تعلمون" (سورہ بقرہ آیت : ۱۵۱) اور وہ (پیغمبر اسلام) تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جسے تم نہیں جانتے ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے : " وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم " ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ تم اس کی آیتیں لوگوں کو سمجھاؤ اور بیان کرو ۔ (سورہ نحل آیت ۴۴) پتہ چلا قرآن کی آیتیں بعض وقت تبیین و وضاحت کی محتاج ہوتی ہے اور پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو

روایات میں "عرض علی الکتاب "(۱)، کے عنوان سے ایک مستقل باب موجود ہے اور جس کا ذکر اصول کی کتابوں میں بھی تعادل و ترجیح کے عنوان سے مذکور باب میں ملتا ہے کہ روایتوں کے درمیان ترجیح یا ان کے قابل اعتبار ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط ان کی قرآن کے ساتھ موافقت یا عدم مخالفت بھی ہے۔

لہٰذا جب ہم کسی روایت کا اعتبار برقرار رکھنے یا کم از کم اس کو دوسری روایت پر ترجیح دینے کے لئے قرآن کے ساتھ اس کی مطابقت کریں تو آیت کا مفہوم ہم پر واضح و روشن ہونا چاہئے تاکہ روایت کی اس کے ساتھ تطبیق کر سکیں اور اگر یہ صورت ہو کہ آیت کا مفہوم بھی روایت کے ذریعہ سمجھا جائے تو دور لازم آتا ہے لہٰذا یہ اشتباہ کہ کوئی شخص روایت کی طرف رجوع کئے بغیر قرآن کے بارے میں فکر و تدبر اور استفادہ کا حق نہیں رکھتا ایک خیال خام ہے ہم کو خود قرآن میں خداوند متعال نے بھی حکم دیا ہے اور پیغمبر اکرم و ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بھی قرآنی آیات میں غور و فکر کی تاکید کے ساتھ دعوت دی ہے۔ مگر افسوس گذشتہ دور میں اس جانب کوتاہی سے کام لیا گیا یہاں تک کہ قرآن اور تفسیر قرآن کے دروس حتی دینی علمی مراکز میں بھی ضعف و اضمحلال کا شکار بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے۔

اور پھر حوزۂ علمیہ قم میں علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ کو یہ توفیق حاصل ہوئی کہ انہوں نے حوزۂ علمیہ قم میں تفسیر قرآن کو حیات نو بخشی اور یہ عظیم افتخار ان کے نصیب میں آیا ہم سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ آج اسلامی معارف کی شناخت کے سلسلہ میں عظیم ترین ماخذ و مدرک یہی تفسیر المیزان ہے جو آپ نے تالیف فرمائی ہے۔

بہرحال، وہ ذمہ داری جو ہم پر خداوند عالم اور اس کے پیغمبرؐ کی جانب سے مقرر کی گئی ہے

سمجھائے، یقینی طور پر تبیین، تلاوت سے الگ ایک چیز ہے اور ہم شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ تبیین - بیان و فصاحت (جو آنحضرتؐ کے مقام و منصب میں سے ہے) ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہے، نیز دیگر دلیلوں کے مطابق (کہ اس وقت جس کے ذکر کا محل نہیں ہے) قرآن کی معلمی کا منصب پیغمبر اسلام اور ائمہ اطہار کے خصوصیات سے ہے۔

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۷۸، ۸۹ حدیث: ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۹، ۳۵، ۳۷، ۴۰، ۴۷، ۴۸۔

اس کے تحت ہمیں قرآن کے بارے میں غور و فکر اور تدبر و تعقل سے کام لے کر ان گراں بہا موتیوں سے استفادہ کرنا چاہیئے جو خداوند عالم نے لوگوں کے لئے اس میں ذخیرہ کر دیئے ہیں۔

آج بحمد اللہ قرآن کریم کی تعلیم و تفسیر کی اہمیت ہمارے عوام پر بڑی حد تک روشن و واضح ہو چکی ہے ان کے درمیان تفسیر قرآن کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے بے نظیر ہے عوام کے درمیان اس کا استقبال اور ان کی گرم جوشی اگرچہ دل کو شادمانی عطا کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات سے خوف زدہ رہنا چاہیئے کہ کہیں قرآن کی تفسیر کجروی کا شکار نہ ہو جائے کیونکہ یہ چیز نہ صرف یہ کہ معاشرہ کو حقائق سے قریب نہیں کر سکتی بلکہ شیطانی مقاصد کے لئے راہ کھول دے گی اور افسوس یہ کام ہوا بھی ہے۔ آج مختلف ناموں سے ایسے گروہ موجود ہیں جو بزعم خود قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ذاتی افکار کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے کے دعویدار ہیں ان میں سے بعض کا چہرہ تو بالکل پہچانا جا چکا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو گویا ابھی اچھی طرح پہچانے نہیں جا سکے ہیں لیکن اس میدان میں ان کی سرگرمی بہت بڑھی ہوئی ہے لہٰذا اگرچہ قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں عوام خصوصاً نوجوانوں کی بے پناہ دلچسپی ہمارے لئے خوشی کا باعث ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں خبردار رہنا چاہیئے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں انحراف کی وہ روش پیدا نہ ہونے پائے جو خدانخواستہ معاشرہ کو غلط راہ پر لگا دے اور یقیناً اس منزل میں بھی، یہ بھاری ذمہ داری علما کے دوش پر ہی عائد ہوتی ہے کہ وہ قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے صحیح راہ مشخص و معین کریں کیونکہ تمام کے تمام منحرفین جان بوجھ کر کسی غرض کے تحت اسلام اور اسلامی حکومت کے دشمن نہیں بن گئے ہیں بلکہ ان کی بڑی تعداد ——— شاید اکثریت ——— اشتباہات اور غلط تعلیمات و تلقینات کا شکار ہو کر اس راہ پر لگ گئی ہے اور کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان میں سے بعض کو ماضی میں، بعض علماء کی تائید بھی حاصل رہی ہے۔

بہر حال ہمیں ان مسائل سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ نپٹنا چاہیئے اور خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمیں تعلیم قرآن کی وہ درست راہ حل کی پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام نے نشان دہی کر دی ہے اپنانا چاہیئے اور تمام تر خود غرضانہ مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کو خود اپنے مقاصد و افکار سے تطبیق کرنے کے بجائے کوشش کرنا چاہیے کہ اپنے افکار کو قرآن کی روشنی میں درست کریں کیونکہ یہ وہ بلا ہے جو امیر المومنین علیہ السلام کے زمانے میں بھی رائج تھی اور نہج البلاغہ میں حضرتؑ نے اپنے جن دردوں کی

فراہم کی ہے ان میں سے ایک یہی ہے کہ بعض لوگ قرآن کو خود اپنے افکار پر منطبق کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

جب اس زمانے میں، حتی عہد پیغمبرؐ سے اتنا قریب ہونے اور حضرت علیؑ جیسے افراد کی موجودگی کے باوجود اس طرح کا انحراف اور گمراہی پیدا ہو سکتی ہے تو اس زمانہ میں جبکہ ہماری علمی کمزوریاں بھی واضح ہیں، کوئی بعید نہیں ہے کہ یہ کجی بہت ہی زیادہ وسیع پیمانے پر پیدا ہو۔

لہٰذا، بلا شک وشبہ یہ علماء اسلام کی واجب ترین ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ قرآن کریم کے تمام تر مفاہیم مختلف علمی سطحوں (اعلیٰ، اوسط یا ادنیٰ) کے اعتبار سے جس قدر بھی ممکن ہو صحت و یقین کے ساتھ بیان کریں اور معاشرہ کو قرآنی خزانوں سے بہرہ ور کریں۔ اور اگر یہ اہم ترین کام انجام نہ پایا اور علماء نے اس طرف توجہ نہ دی تو گمراہی کی جو صورت آج ہم دیکھ رہے ہیں اس سے بھی بدتر صورت حال کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔

آج زیادہ تر مسلمان نوجوان اس کے لئے تہہ دل سے آمادہ اور بیتاب ہیں کہ قرآنی مفاہیم کو سمجھیں اور یاد کریں حتی اپنے خیال و دماغ کے اعتبار سے وہ 'المعجم' اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع کر کے اس پر تحقیق فرمانے کی بھی کوشش کرتے ہیں وہ فکر کرتے ہیں کہ یہ ایک معمولی اور سادہ سا کام ہے۔ شاید یہ لوگ اپنے اس گمان میں معذور ہوں لیکن وہ لوگ جو برسوں علمی دینی مراکز میں رہے ہیں اور حوزۂ علمیہ میں بزرگوں سے آیات و روایات میں دقت نظر سے کام لینے کا درس لیا ہے اگر وہ بھی اسی انداز میں فکر کریں تو حق یہ ہے وہ ہرگز قابل معافی نہ ہونگے۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین و اصول جو بزرگ علماء و مفسرین نے ہمارے حوالے کئے ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ غور و فکر سے کام لے کر قرآن کے روشن و واضح مفاہیم اخذ کریں اور معاشرہ تک پہنچائیں تا کہ قرآن و اسلام کے تئیں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں دوسری طرف، اگرچہ قرآن کا آسانی سے سمجھنا اور تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی ایک شخص جو قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اس سے اگر ہم کہیں کہ اس کے لئے کم از کم تم کو تیس سال کام کرنا ہوگا، تعلیم حاصل کرنی ہوگی تب کہیں تم قرآن سمجھنے کے قابل ہو سکو گے تو گویا ہم نے اس کو قرآنی مطالب سمجھنے اور یاد کرنے سے مایوس کر دیا۔ اور نتیجہ میں اس کا منحرفین کے ہتھے چڑھ جانا یقینی ہے۔

ٹھیک ہے کہ قرآن کا سمجھنا، خاص زحمت، محنت اور مہارت کا طالب ہے اور یہ کام سب نہیں کر سکتے اس لئے چند افراد کو بہر حال یہ زحمتیں اٹھانا ہوں گی تاکہ وہ اپنی محنت و ریاضت کا پھل دوسروں کی خدمت میں تقدیم کریں تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

جو باتیں ہم پیش کریں ان کے مستند اور قرآن کریم پر مبنی ہونے کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہونا چاہیئے اسی کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے غیر مربوط اور نظم و ترتیب سے عاری بھی نہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر مطالب پراگندگی کا شکار ہوں تو نہ صرف ان کا یاد رکھنا مشکل ہے بلکہ ایک غلط فکری نظام کے مقابلہ میں ایک صحیح فکری نظام سے جو فائدہ اٹھانا چاہئے وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔

تمام منحرف مکاتب فکر نے اپنے افکار و تصورات کو ایک نظم اور ایک شکل دینے کی کوشش کی ہے یعنی انھوں نے چاہا ہے کہ اپنے مطالب کی ایک بنیاد پیش کریں اور مربوط مسائل کے ایک سلسلہ کو آپس میں ربط دے کر ایک منتظم و ہم آہنگ مجموعہ وجود میں لے آئیں۔ ہم تو صحیح جہت اور صحیح راہ رکھتے ہیں ہمیں ان کے مقابلے میں بعینہ یہی کام کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم قرآنی معارف کو ایک منتظم اور سسٹیمٹک انداز میں اس طور پر پیش کریں کہ ایک محقق اور علم کا متلاشی ذہن ایک نقطہ سے شروع کرے اور اسلامی معارف کی کڑیاں کسی زنجیر کے مانند ایک دوسرے میں پروتا چلا جائے اور آخر میں قرآن و اسلام نے جس ہدف و مقصد تک پہنچانا چاہا ہے اسے حاصل کرلے۔

بنابریں ہم قرآنی معارف کی تقسیم بندی کر کے اسے ایک نظم و ترتیب کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور ہیں تاکہ ایسے نوجوانوں کے لئے جن کے پاس وقت کم ہے، اس کا سیکھنا آسان اور ممکن ہو دیگر مکاتب فکر کے مقابلے میں بھی پیش کیا جاسکے۔

قرآنی معارف کی تقسیم بندی جو قرآن کی تفسیر موضوعی کے ساتھ منسلک ہے (یعنی آیات قرآنی کو موضوعات کے تحت الگ الگ تقسیم کردیں اور ان کے مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں نیز ان کے درمیان رابطہ کو پیش نظر رکھیں) یہ کام اگرچہ ضروری ہے مگر اس میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔

قرآنی معارف کی ترتیب و تقسیم کے لئے ہمیں موضوعات سے متعلق ایک خاص نظم و ترتیب ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے، اس کے بعد ہر موضوع سے متعلق آیتیں تلاش کرنا پھر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھنا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنا اور ان کے مبہم نکات کو روشن و واضح

کرنے کے لئے اُن ہی آیتوں میں ایک دوسرے سے مدد حاصل کرنا چاہیئے۔ یعنی قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنا چاہیئے وہی راہ جو علامہ طباطبائی طاب ثراہ نے اپنی تفسیر المیزان میں دکھائی اور اپنائی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف بھی متوجہ رہنا ضروری ہے کہ جب ہم نے ایک آیت کو اس کے مخصوص سیاق سے نکال کر الگ کر لیا اور اس کے قبل و بعد کی رعایت کئے بغیر تنہا اسی کو اپنا محور قرار دیا تو ممکن ہے آیت کے حقیقی مطلب تک ہم نہ پہنچ سکیں۔ دوسرے لفظوں میں قرآن میں کلامی قرائن پائے جاتے ہیں اور یہ قرائن کبھی آیت سے پہلے کبھی اس کے بعد اور کبھی کبھی تو دوسرے سوروں میں نظر آتے ہیں ان قرائن پر توجہ کئے بغیر آیتوں کے حقیقی و واقعی مطالب تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان حالات سے دوچار نہ ہوں اور آیتیں سب ایک دوسرے سے جدا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنے واقعی مطلب سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں تو ہمیں کافی وقت نظر سے کام لینا ہو گا یعنی کسی آیت کو کسی موضوع کے تحت قرار دینے سے پہلے اس آیت کے قبل و بعد پر بھی نظر کر لینا چاہیئے اگر احتمال پیدا ہو کہ قبل و بعد کی آیتوں میں کوئی قرینہ موجود ہے تو اس کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ ہم جس آیت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس کا قبل و بعد کی آیتوں کے ساتھ ذکر کریں اور دونوں حصوں کو بریکٹ میں لکھ دیں تاکہ آیت سے استفادہ کرتے وقت متعلقہ "گفتگو کے قرائن" کی طرف سے غفلت کا شکار نہ ہوں۔

میں اس نکتہ کی طرف ایک بار پھر متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ آیت کے قبل و بعد اس کے قرائن پر غور و فکر کے بعد ہی کسی آیت سے استدلال کرنا چاہیئے، حتی مقالہ نگار کو خود اس مرحلے سے دوچار ہونا پڑا ہے کہ بعض وقت ایک آیت سے متعلق غور و فکر کے بعد اظہار نظر کرتا ہوں اور پھر ایک مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہوں کہ اس سے قبل کی آیت میں قرینہ موجود تھا جس کی طرف اس وقت متوجہ نہیں ہو سکا تھا اگر اس کی طرف متوجہ ہو گیا ہوتا تو استدلال میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا یا یہ کہ استدلال کا رخ کچھ اور ہوتا لہٰذا ہمیں اس نکتہ کی طرف سے ہرگز غفلت نہیں برتنا چاہیئے

جب ہم قرآن کے مفاہیم و معارف کی تقسیم بندی پر مجبور ہیں اور اس تقسیم بندی کے نتیجہ میں طبیعی طور پر آیتوں کی بھی تقسیم بندی کرنا پڑے گا (یعنی ہر باب کے ذیل میں چند آیتوں کا ذکر ضروری ہو گا) تو ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ آیتوں کی یہ تقسیم بندی کس بنیاد پر اور کس نظام کے تحت انجام دیں؟

سبھی جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں انسانی کتب میں رائج تقسیم بندی کے طریقوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے بہت ہی کم ایسے سورے ملیں گے۔ حتی ایک سطری سورے کیوں نہ ہوں۔ جن میں شروع سے آخر تک صرف ایک موضوع پر گفتگو کی گئی ہو زیادہ تر ۔۔۔ حتی ایک ہی آیت میں کئی کئی مطالب سمو دیئے گئے ہیں اس طرح ایک ہی آیت مختلف پہلوؤں اور گوناگوں رخوں سے قابل استفادہ نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک ہی آیت میں اعتقادی پہلو بھی موجود ہے اور اخلاقی بھی، تاریخی پہلو بھی ہے اور تشریعی بھی وغیرہ وغیرہ چنانچہ آیات کے تجزیے میں یہ بھی ایک مشکل پیش آتی ہے البتہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ایک ہی آیت کو ہم متعلقہ مختلف عنوانوں کے تحت تکراری طور پر ذکر کر سکتے ہیں۔

آیات کی تقسیم

کسی مفہوم یا موضوع کے تحت ایک یا چند آیتوں کے لئے مثلاً نماز، جہاد، یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق آیتوں کے لئے ایک جامع اور کلی عنوان تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے البتہ چند عنوانات کو ربط و ترتیب کے ساتھ ایک منظم شکل دینا یا ایک زنجیر میں پرو دینا واقعی مشکل ہے۔ یعنی فرض کیجیئے کہ ہم نے پورے قرآن کی تحقیق کی اور جو مفاہیم ہاتھ آئے مثلاً سو عناوین ان کے تحت، ہم نے ان کی تقسیم بندی کر دی اب مسئلہ یہ ہے کہ خود ان عناوین کو کس طرح مرتب کریں کہ ایک منظم نظام وجود میں آجائے؟ مثال کے طور پر قرآن کی پہلی آیت حمد باری تعالیٰ میں ہے لہٰذا پہلا عنوان "حمد خدا" قرار دیں اسی طرح سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ قرآنی ہدایت جن کے شامل حال ہوئی ہے لہٰذا دوسرا عنوان "ہدایت" قرار پائے گا اور اسی طرح تمام عنوانات، لیکن کیا ہم اسی ترتیب سے تمام عنوانات کی تقسیم بندی کریں؟ یا خود ان عنوانات کے درمیان بھی ایک نظم و ترتیب ممکن ہے اور ان کی ابتدا کے لئے بھی ایک طبیعی و منطقی نقطہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟

ان عناوین کو ایک زیادہ جامع اور ہمہ گیر عنوان کے تحت درج کیا جا سکتا ہے مثلاً نماز روزہ، خمس اور زکوٰۃ وغیرہ کو "عبادات" کے عنوان سے، بیع (خرید و فروخت)، اجارہ

(کرایہ داری) اور قرض وغیرہ کو معاملات کے عنوان کے تحت درج کیا جا سکتا ہے اب ان جامع اور کلی عنوانوں کو کس طرح تنظیم و ترتیب دیں؟ اور ان کے درمیان کون سا رابطہ ملحوظ نظر رکھیں؟

تقسیم کے قاعدے

اس منزل میں تین قاعدے بیان کئے جا سکتے ہیں (دیگر قواعد بھی ممکن ہیں لیکن ہم نمونہ کے طور پر یہاں قرآنی معارف کی تقسیم بندی کے جو اہم قاعدے پیش کئے جاتے ہیں بیان کر رہے ہیں تاکہ ان کے درمیان سے ایک قاعدہ اپنے لئے منتخب کر سکیں)۔

پہلا قاعدہ

شاید ذہن اس تقسیم بندی سے زیادہ آشنا ہوں کہ تمام دینی مطالب تین قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ۱۔ عقائد ۲۔ اخلاق ۳۔ اور احکام۔ تفسیر المیزان میں بھی بہت سے مقامات پر اس روش کا ذکر کیا گیا ہے اس طرح تقسیم بندی کا ایک طریقہ تو یہ ہوا کہ تمام قرآنی معارف کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ اصول عقائد (توحید، نبوت، معاد، عدل اور امامت) نیز ان اصول دین کے جزئیات مثلاً عالم برزخ کے جزئیات کے باب میں، دوسرا حصہ اخلاق کے باب میں اور تیسرا حصہ احکام کے باب میں ہو اور ہمارے فقہا نے احکام کے باب میں یہ کام کیا بھی ہے انہوں نے آیات الاحکام کے موضوع پر "کنز العرفان" اور "زبدۃ البیان" جیسی مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

یہ قاعدہ شاید دیکھنے میں بہت اچھا محسوس ہو اور بظاہر ہے بھی بہت خوب۔ لیکن اس میں معمولی طور پر سہی دشواریاں اور خرابیاں بھی نکالی جا سکتی ہیں اولاً یہ کہ تمام مفاہیم قرآنی کو ان تین حصوں میں سمونا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر قرآنی آیات کا خاصا اہم حصہ تاریخ انبیا اور پیغمبروں کے واقعات پر مشتمل ہے اگرچہ ان داستانوں کے ضمن میں بھی توحیدی، تشریعی اور اخلاقی نکتے موجود ہیں لیکن پوری کی پوری داستان اس فہرست میں رکھی جا سکتی نہ اس فہرست میں بلکہ یہ خود ایک مخصوص حصہ اور مستقل عنوان ہے جن کو اگر جملوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے تو داستان باقی نہ رہے گی

اور اگر کوئی اصحاب کہف سے متعلق قرآنی نقطہ نظر معلوم کرنا چاہے اس کو پتہ نہ ہوگا کہ یہ واقعہ کس باب میں تلاش کرے ایک روشن و گویا باب جس کے ذیل میں ہر انسان آسانی سے تمام قرآنی داستانیں شخصی طور پر جان لے اس تقسیم کے تحت میسر نہ ہوگی۔

اس میں، جزئی طور پر، ایک قابل اعتراض پہلو یہ بھی ہے کہ خود یہ تینوں اقسام ایک دوسرے سے کوئی واضح رابطہ و تعلق نہیں رکھتیں اور بڑی دقت کے ساتھ ہی ان میں رابطہ قائم کیا جاسکے گا، البتہ یہ اعتراضات بڑی ہی جزئی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے بہتر و مناسب کوئی دوسری راہ نہ ہونے کی صورت اس ہم اسی قاعدہ پر عمل کر سکتے ہیں۔

دوسرا قاعدہ

دوسرا قاعدہ اس بات پر مبنی ہے کہ قرآن کو انسان کے لئے ہدایت مانتے ہیں: "ھدیً للنّاس" اور انسان چونکہ گوناگوں مادی، معنوی، فردی، اجتماعی. دنیوی و اخروی پہلوؤں کا حامل ہے لہٰذا قرآنی معارف کو وجود انسانی کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں اس طرح قرآنی معارف کی تقسیم بندی کا محور خود " انسان " کو قرار دیتے ہیں۔

یہ کام یقیناً ممکن ہے اور اس میں کوئی بنیادی نوعیت کا قابل اعتراض پہلو بھی نظر نہیں آتا لیکن فنی کمزوریاں پہلے قاعدہ سے زیادہ اس میں ہیں کیونکہ جب ہم قرآن کے دقیق مفاہیم سے آشنا ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خود انسان کو محور قرار دینا قرآن کی نظر میں بہت زیادہ قابل قبول نہیں ہے، اور یہ ایک قسم کا " ہیومنسٹ " طرز فکر ہے جس میں انسان کو اصل قرار دیتے ہیں اور ہر چیز کی قدر و قیمت انسان سے ربط و تعلق کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں! قرآن اس انداز فکر کا موافق نہیں ہے، ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ تمام قرآنی مفاہیم کے تمام ابواب عقائد سے لے کر اخلاق، موعظہ، داستان، تشریع، فردی و اجتماعی احکام وغیرہ تک سب کے سب ایک اور صرف ایک محور رکھتے ہیں اور وہ خود خداوند تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے، چنانچہ قرآن جہاں کوئی قانون اور حکم بیان کرتا ہے کہتا ہے: خدا نے تم پر یہ حکم نازل فرمایا ہے، جہاں کسی اخلاقی پہلو کا ذکر کرتا ہے کہتا ہے یہ وہ خلق و عادت ہے جو خدا کو پسند ہے ــــــ

ملاحظہ فرمائیں :۔

سورۂ مائدہ کی ۴۲ ویں آیت : " واللہ یحب المقسطین " ۔ (اللہ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے)
آل عمران کی ۱۴۶ ویں آیت : " واللہ یحب الصابرین " ، (اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)
قصص کی ۷۷ ویں آیت : " ان اللہ لا یحب المفسدین " (اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا)

لہٰذا اخلاق کا محور بھی خدا کی ذات ہے ، بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی آیات " اللہ محوری " کی اساس پر مبنی ہیں دوسرے لفظوں میں مکتب قرآن مکتب الٰہی ہے " ہیومنزم " نہیں ہے ۔ پس انسان کو محور کل قرار دینا ایک طرح کا انحراف ہے قرآنی معارف کا محور خدا کو قرار دینا چاہیئے اور اس کی پوری طرح حفاظت کرنا چاہیئے ۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ انسانی وجود کے پہلو مبہم ہیں اور یہی مشخص نہیں ہے کہ انسان کتنے جنبوں کا حامل ہے کہ ہم کہہ سکیں انسانی وجود کے ان پہلوؤں کی ایک واضح تقسیم بندی کی بنیاد پر قرآنی آیات کی تقسیم بندی کرلی جائے ۔ دوسری طرف پہلی نظر میں وجود انسان کے تمام پہلوؤں کے درمیان کوئی واضح ارتباط بھی نہیں پایا جاتا (۱)

تیسری دشواری یہ ہے کہ انسانی وجود کے مختلف پہلو (اگر مشخص ہو بھی جائیں) تو ان کی بنیاد پر قرآنی معارف کی تقسیم بھی ایک لاحاصل کام ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں ۔ بعض اوقات ایک حکم الٰہی اور ایک خلق و عادت جس کو انسان کے لئے اچھا قرار دیا گیا ہے انسان کے کسی ایک مخصوص جنبہ سے اس کا تعلق نہیں ہے بلکہ وجود انسانی کے بہت سے گوشے اس حکم و قانون اور اخلاق سے اس طور پر تعلق رکھتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا قرآن کا یہ بیان یقینی طور پر انسانی وجود کے فلاں پہلو سے مربوط ہے ۔

تیسرا طریقہ

یہ ہے کہ خود اللہ کو محور قرار دیں اور قرآنی معارف کی تقسیم بندی عرض میں نہیں بلکہ ایک دوسرے

۱۔ ممکن ہے بعد میں قرآن کے ذریعہ ہم اس ارتباط کو درک کرلیں لیکن پہلی نظر میں انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کے درمیان

کے طول میں انجام دیں یعنی قرآنی معارف کو ایک ایسے بہتے ہوئے دریا اور آبشار کی مانند خیال کریں کہ جس کا منبع و سرچشمہ فیض الٰہی ہے یہ جس منزل اور مرحلے میں پہنچتا ہے سیراب کر دیتا ہے ۔

"اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌ بِقَدَرِهَا..." (رعد/ ۱۷)

"خداوند عالم آسمان سے جو پانی برساتا ہے اپنی ظرفیت کے اعتبار سے ہر وادی اس سے استفادہ کرتی اور سیراب ہوتی ہے ۔"

ہمیں اسلامی معارف کو ایک بہتا ہوا چشمہ خیال کرنا چاہیئے جو ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلہ میں وارد ہوتا ہے اور ان مرحلوں کے تقسیمات طولی ہیں عرضی نہیں ہیں ابتداءً ایک مخصوص نقطہ سے یہ چشمہ ابلنا شروع کرتا ہے جب وہ جگہ لبریز ہو جاتی ہے اس کا فیضان دوسری جگہ پہنچتا ہے اب یہ دوسری جگہ پہلی جگہ کی فرع قرار پائے گی نہ یہ کہ اسی کے برابر اور اسی کی قسیم ہو ۔ اگرچہ ایک منزل میں ان طولی تقسیمات سے بھی مختلف شاخیں پھوٹنا شروع کر دیتی ہیں پھر بھی بنیادی طور پر اسلامی معارف کو طول مراتب کے اعتبار سے ہی ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے ۔ ہماری نظر میں یہ قاعدہ چند دلیلوں کے تحت قابل ترجیح ہے ۔

پہلی دلیل

اس میں محور خدا کی ذات ہے اور اس کے برابر و متساوی کسی بھی چیز کو قرار نہیں دیتے :۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (حدید/ ۳)

وہی (خدا) اول بھی ہے اور آخر بھی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ۔

دوسری تقسیمات کے برخلاف کہ جس میں یا تو اصل محور انسان کی مانند کسی دوسری شئی کو قرار دیتے ہیں یا اگر توحید و عقائد سے بھی بحث کرتے ہیں تو اسی کے برابر و متساوی اخلاق و احکام کا اعتقادات کے قسیم کے طور پر ذکر کرتے ہیں ۔ لیکن اس تقسیم میں ابتدائی طور پر ایک کے علاوہ کوئی بھی دوسری بحث نہیں ہے اور نہ ہی اس کے متوازی کسی دوسری بحث کو رکھنے کی گنجائش

کسی واضح ارتباط کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ۔

ہے۔ جب تک یہ بحث حل نہ ہو اور اس سے فارغ نہ ہو جائیں دوسرے مرحلے اور دوسری بحث تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ یہ تقسیم بندی اللہ کو محور قرار دے کر انجام پاتی ہے۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام مسائل و تقسیمات کے درمیان ایک منطقی ترتیب پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ جب ان مختلف بحثوں کا سلسلہ آپس میں مربوط ہو تو فطری طور پر پہلے کی بحث بعد کی بحث پر کسی نہ کسی نوعیت سے مقدم ہوگی، کہ جو واضح اور قابل فہم ہے اس کے برخلاف دوسری وہ تقسیمات جن میں مختلف بحثوں کو ایک دوسرے کے عرض میں متوازی قرار دیتے ہیں ایک کو دوسرے پر مقدم قرار دینا توجیہ و وضاحت کا محتاج ہوگا بلکہ بعض اوقات اس میں مشکل بھی پیش آسکتی ہے۔ فرض کیجیے انسان کی فردی و اجتماعی حیثیت، اس کے وجود کے دو پہلو ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس کے فردی جنبہ کو پہلے بیان کریں یا اجتماعی پہلو کو؟ یا یہ کہ ان دونوں پہلوؤں کو مقدم سمجھیں؟ یا سرے سے کوئی دوسری تقسیم اس کے مادی و معنوی جنبہ کے پیش نظر کریں؟ یہ ایک مسئلہ ہے لیکن اگر مختلف عنوانات کے درمیان ایک فطری و طبیعی ترتیب موجود ہو اور اسی فطری و منطقی ترتیب کے تحت تقسیم بندی انجام پائے تو تقدم و تأخر کے لئے ہمارے پاس ایک روشن و واضح دلیل موجود ہوگی اور اس طرح ایسا محکم و منسجم نظام وجود میں آئے گا، جس میں گذشتہ قاعدوں کی طرح اعتراض کی گنجائش نہ رہے گی۔ بنابراین بہتر ہے کہ تمام معارف قرآنی کا اصل محور "اللہ" کو قرار دیں، جو قرآنی تعلیمات سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ سب سے پہلے خدا کی معرفت اور انسان کی معرفت سے متعلق مسائل سے ابتدا کریں اس کے بعد تمام انسانی مسائل پر الٰہی تعلیم و تربیت و تدبیر و حکمت کی روشنی میں بحث کریں۔ اس طرح قرآنی معارف کا ایک ایسا منظم و مرتب نظام وجود میں آئے گا جس کا اصل محور بھی اصالت و حقیقت پر مبنی ہوگا۔ اور اس کے گرد بننے والے دائروں کے درمیان بھی ایک نظم و ترتیب اور ربط و تعلق پایا جائے گا۔

اس قاعدے اور اصول کی بنیاد پر قرآنی معارف کا ڈھانچہ اور نظام مندرجہ ذیل عناوین پر قائم ہوگا

۱۔ خدا کی معرفت

اس میں خدا کی معرفت: توحید، صفات الٰہی اور کلیات افعال باری تعالیٰ کی بحثیں شامل ہیں

۲۔ کائنات کی معرفت

اس میں کائنات (زمین، آسمانوں اور ستاروں)، فضائی موجودات (رعد و برق و باد و باراں

وغیرہ) اور زمینی مخلوقات (پہاڑ اور دریا وغیرہ) نیز ضمنی طور پر عرش و کرسی فرشتہ، جن اور شیطان وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں

ظاہر ہے افعال باری تعالیٰ سے متعلق کلیات — جو پہلے حصہ میں انجام پاتے ہیں — کے بعد خود افعال کے تفصیلات (خلق و تدبیر وغیرہ) کے ذکر کی نوبت آتی ہے اور طبیعی طور پر کائنات کی پیدائش کا ذکر انسان کی پیدائش پر مقدم ہے۔

۳۔ انسان کی معرفت

اس میں انسان کی پیدائش، روح کی خصوصیات، انسانی شرافت وعظمت، ذمہ داریاں اور ان کے شرائط (آگاہی، قوت، عمل بااختیار)، انسانی وجود کے مختلف پہلو، فردی و اجتماعی تدبیروں میں الٰہی سنتیں، معاد اور انسان کا آخری انجام، وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں۔

اس مرحلے میں روشن و واضح ہو جاتا ہے کہ دنیوی زندگی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے یہ انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کو خود اپنے لئے راہ سعادت کا انتخاب کرنا چاہیئے اور اپنے آخری انجام کی داغ بیل ڈالنا چاہیئے اس دنیا میں الٰہی حکمتیں انتخاب کے مقدمات (ابتلا و آزمائش وغیرہ) کی فراہمی کے محور پر گردش کرتی ہے۔

۴۔ راہ وروش کی معرفت

اس منزل میں شناخت و معرفت کے عادی طریقوں (یعنی دنیا میں رائج علم حضوری و علم حصولی کی مختلف قسموں) اور غیر عادی طریقوں (یعنی وحی و الہام وغیرہ) سے متعلق بحثیں شامل ہیں یہیں نبوت کا مسئلہ بعثت انبیاء کی ضرورت اور مقاصد، نیز ان کے مدارج (نبوت، رسالت و امامت اور اسی طرح معجزہ و عصمت سے متعلق مسائل بیان ہوتے ہیں اور آخر میں انبیاء کی جانشینی کے مسئلے (یعنی امامت اپنے خاص معنوں) پر بحث ہوتی ہے۔

بحث کے اس مرحلے کا تعلق اپنے گذشتہ مرحلے سے واضح ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو انتخاب کی آزادی حاصل ہے یعنی اسے اپنی راہ کا تعین آزادانہ طور پر خود کرنا ہے راہ و روش کی معرفت کی ضرورت خود بخود پیش آتی ہے اور اسی مرحلے میں یہی چیز

موضوع بحث ہے۔

۵۔ رہبر و رہنما کی معرفت

اس منزل میں انبیا کی تاریخ اور ان میں سے ہر ایک کے خصوصیات ان پر نازل ہونے والی کتابیں، ان میں پیش کئے جانے والے مطالب، پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ اور آنحضرت کے زمانۂ حیات میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات بیان کئے جاتے ہیں ضمنی طور پر تمام قرآنی داستانیں اور اقوام و ملل کی تاریخ بھی اسی ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔ اس حصہ کا اپنے گذشتہ حصے کے ساتھ ربط اور ترتیب بیان واضح ہے کیونکہ جب وحی و نبوت کی ضرورت و اہمیت سے ہم واقف ہو گئے تو اب ان حاملان وحی و رسالت کی معرفت کی نوبت آتی ہے جو پیغام وحی عوام الناس تک پہنچاتے رہے ہیں۔

۶۔ قرآن کی معرفت

اس میں قرآن سے متعلق اصولی و کلیاتی مباحث۔ اس کے خصوصیات، نزول کا مقصد، نزول کا انداز، اعجازی حیثیت، آفاقی و ابدی شان، اسلوب بیان (عقلی استدلال، موعظہ، جدال احسن تمثیل و قصص وغیرہ) نیز محکم و متشابہ اور تاویل وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں۔ گذشتہ بحث سے اس کا بھی ربط اور ترتیب بیان واضح ہے اس لئے کہ گذشتہ آسمانی کتابوں کے ذکر و بحث کے بعد آخری و ابدی کتاب کی شناخت و معرفت فطری سی بات ہے۔

۷۔ اخلاق اور انسانی تعمیر

اس میں خود انسان کی اپنی معرفت اور اپنی تعمیر سے متعلق تمام بحثیں شامل ہیں، افعال اختیاری میں خیر و شر کا وجود اور ان کا آخری کمال و سعادت کے ساتھ ربط، قرآنی تربیت و تزکیۂ نفس کی روش (انذار و بشارت کے ذریعہ تلاش خیر کا جذبہ بیدار کرنا وغیرہ) انسانی تعمیر میں ایمان و عمل کا کردار اور ان کا ایک دوسرے سے رابطہ نیز ان دونوں کا علم سے ارتباط اور بالآخر اخلاق فاضلہ و اخلاق رذیلہ کی تفصیلات اس بحث کا حصہ ہیں۔

"قرآن کی شناخت و معرفت" کے بعد "اخلاق اور انسانی تعمیر" کا ذکر اس لئے ہے کہ گذشتہ بحث میں ہم اسی نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ قرآن کا ہدف و مقصد تزکیہ و تعلیم ہے۔ تزکیہ اخلاق اور انسانی

تعبیر سے متعلق بحثوں کو جنم دیتا ہے اور تعلیم آئندہ مباحث کو وجود میں لاتی ہے۔

۸۔ قرآن کے عبادی احکام

اس میں نماز و روزہ، حج و قربانی اور ذکر و دعا سے متعلق بحثیں شامل ہیں یعنی جہاں وہ اعمال ذکر ہوتے ہیں جو بنیادی طور پر انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کو تقویت پہنچاتے ہیں اگرچہ اجتماعی مصلحتوں کا بھی ان میں بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

۹۔ قرآن کے فردی احکام

اس میں خورد و نوش (یعنی کھانا، پینا، شکار کرنا اور ذبیحہ کرنا وغیرہ) نیز زینت و آرائش اور ترک بھڑک سے متعلق حرام و حلال کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۰۔ قرآن کے اجتماعی احکام

اس میں تمام حقوقی، اجتماعی، سیاسی و اقتصادی بحثیں شامل ہیں جن کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

الف)_____ شہری و مدنی احکام

ب)_____ اقتصادی و معاشی احکام

ج)_____ قانونی و عدالتی احکام

د)_____ حدود و جزاء کے احکام

ہ)_____ سیاسی و حکومتی احکام

و)_____ عالمی و بین الاقوامی احکام

اور بحث کے اس حصے میں مقدمہ کے طور پر "معاشرہ قرآن کی نظر میں" بحث کا مرکز قرار پایا ہے اس تقسیم کے آخری تین حصوں میں انسان سے متعلق قرآن کے پیش کردہ علمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ایک کا تعلق انسان اور خدا، دوسرے کا تعلق انسان اور خود اس کی ذات اور تیسرے کا تعلق انسان اور معاشرے یا انسان اور دوسرے انسانوں سے ہے اور ہر حصہ سے متعلق اس آسمانی کتاب کی تعلیمات کو جداگانہ طور پر مورد بحث و تحقیق قرار دیا جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی معارف عالم ہستی کے نقطۂ آغاز سے شروع

ہوتے ہیں اور خلق و تدبیر الٰہی کے مراحل بالترتیب زیر بحث آتے ہیں اور یہ سلسلہ ایک ایسے معاشرے کے خصوصیات کے ذکر پر منتہی ہوتا ہے جو انسان کی دیرینہ آرزو ہے اور ان تمام مراحل میں اپنے اصل محور 'ذات خدا' سے ان کا ارتباط بھی باقی و محفوظ رہتا ہے ۔

حکومت کے ارکان

جناب شیخ محمد تقی رہبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

کسی معاشرہ پر حاکم نظام میں فرائض کی تقسیم کے ذیل میں تین طاقتوں کی بات سامنے آتی ہے "مقننہ" یعنی قانون ساز طاقت، "عدلیہ" یعنی قانونی امور میں رجوع، اور حالات کے مطابق احکام صادر کرنے والی طاقت، اور "مجریہ" یعنی احکام کا اجرا کرنے والی طاقت ہم اسی ڈھانچہ کے تحت اسلامی نظام کے ارکان کو مشخص کرنا چاہیں تو یہ کہیں گے کہ اس ڈھانچہ کی سب سے پہلی طاقت یعنی قانون ساز طاقت تو جس طرح دوسرے تمام سیاسی نظام اس کی تعریف بیان کرتے ہیں اسلام میں سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرے سیاسی نظام عوامی نمائندوں کی آراء کو ہی مطلق طور سے قانون کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں جو قانونی طور پر اکثریت کی منظوری کے بعد ہی قابل اجراء ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام کے سیاسی نظام میں قوانین کا سرچشمہ پہلے سے مشخص کیا جا چکا ہے اور اس کے تمام اصول و کلیات وحی اور باقی رہنے والی الہٰی شریعت سے ماخوذ ہیں۔

اسلامی شوریٰ یا پارلیمنٹ میں جس بات پر بحث و گفتگو ہوتی ہے وہ موجودہ دور میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل ہوتے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ اسلام کے کلی قوانین میں ان کی کہاں تک گنجائش ہے۔ اور ان ہی کی بنیاد پر موجودہ قوانین مرتب کیے جائیں یہاں اکثریت

آراء بھی اسی بنیاد پر ہے۔ ورنہ آراء و اکثریت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی قانون وضع کیا جائے اور اسلامی قانون کی روح کے خلاف اس پر عمل کیا جائے۔

حکومتی اداروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ الٰہی احکام وسنن اور قوانین کی پورے طور سے حفاظت کرتے ہوئے حکومت کے کلی سیاست کے تحت انھیں پیش کئے جانے اور ان کا اجرا کرنے کے سلسلہ میں پوری توجہ سے کام لیں۔

کتاب وسنّت قانون کا سرچشمہ

حضرت علیؑ، مالک اشتر کے نام تحریر کردہ عہدنامہ میں فرماتے ہیں:۔

"وَارْدُدْ اِلَی اللّٰهِ مَا یُضْلِعُکَ مِنَ الْخُطُوبِ وَیَشْتَبِهُ عَلَیْکَ مِنَ الْاُمُورِ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِقَوْمٍ اَحَبَّ اِرْشَادَهُمْ: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، فَالرَّدُّ اِلَی اللّٰهِ الْاَخْذُ بِمُحْکَمِ کِتَابِهِ وَالرَّدُّ اِلَی الرَّسُوْلِ، اَلْاَخْذُ بِسُنَّتِهِ الْجَامِعَةِ غَیْرِ الْمُفَرِّقَةِ"

(خط نمبر ۵۳)

"جس کام میں بھی تم سنگینی اور الجھاؤ کا احساس کرتے ہو یا جن امور میں تردد کا شکار ہو جاتے ہو انھیں خدا اور اس کے رسولؐ کے حوالہ کر دو کیونکہ خداوند عالم جن لوگوں کی ہدایت کرنا پسند کرتا ہے ان کے لئے فرماتا ہے " اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو، پیغمبرؐ اکرم نیز جو لوگ تم میں ولی امر ہیں ان کی پیروی کرو، لہٰذا اگر کوئی کام نزاع کی حد تک پہنچ جائے تو اسے خدا اور اس کے پیغمبر (ص) کے حوالہ کر دو"۔ خدا کے حوالہ کرنے کا مطلب اس کی روشن اور واضح آیتوں کی طرف رجوع کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اور پیغمبرؐ کے حوالہ کرنے کا مطلب آنحضرتؐ کی وسیع وجامع اور غیر اختلافی سنت کی پیروی ہے۔"

اور اسی خط میں دوسری جگہ رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"وَلَا تَنْقُضْ سُنَّةً صَالِحَةً عَمِلَ بِهَا صُدُورُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَاجْتَمَعَتْ بِهَا الْأُلْفَةُ وَصَلَحَتْ عَلَيْهَا الرَّعِيَّةُ۔ وَلَا تُحْدِثَنَّ سُنَّةً تَضُرُّ بِشَيْءٍ مِنْ مَاضِي تِلْكَ السُّنَنِ، فَيَكُونَ الْأَجْرُ لِمَنْ سَنَّهَا وَالْوِزْرُ عَلَيْكَ بِمَا نَقَضْتَ مِنْهَا"

" ان اچھی اور نیک سنتوں و رسموں کو مت توڑو جن پر اس امت کے بزرگ افراد عمل پیرا رہے ہیں اور جو ملت و قوم کے درمیان اتحاد و دوستی اور اس کی مصلحتوں کے حق میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایسی رسم جاری نہ کرو جو ماضی کی ان سنتوں و رسموں کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ کیونکہ نتیجہ میں ان صالح اور بہترین رسموں کے بانیوں کو تو اس کی جزاء خیر ملے گی اور تمہارے کاندھوں پر ان رسموں کے توڑنے کے عوض گناہوں کا بوجھ ہوگا۔

علماء دین کا کردار

امامؑ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مالک اشتر کو صالح علماء اور نیک نفس حکماء کی ہم نشینی کی نصیحت فرماتے ہیں۔ اور یہ نصیحت بذات خود اس بات کی تاکید ہے کہ حکومت کے ذمہ دار افراد کو رسم و رواج اور قواعد و قوانین کو علماء دین اور حکماء الٰہی کی مفید رہنمائیوں ان کے گراں قدر مشوروں کے مطابق مقرر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ افراد کتاب خدا اور اس کے احکام سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت کے ذمہ دار علماء کی آراء کے برخلاف اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل کرنے لگیں۔ امام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

"وَأَكْثِرْ مُدَارَسَةَ الْعُلَمَاءِ وَمُنَاقَشَةَ الْحُكَمَاءِ فِي تَثْبِيتِ مَا صَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ بِلَادِكَ وَإِقَامَةِ مَا اسْتَقَامَ بِهِ النَّاسُ قَبْلَكَ"

" مذاکرہ اور بحث و گفتگو کے لئے علماء و حکماء کی ہمنشینی زیادہ اختیار کرو اور تاکہ تم ملک کی مصلحتوں اور رفاہ کے کاموں کو قائم و پائدار کر سکو اور قوم کے

اگلے لوگوں کی طرح ملت کے حالات و امور میں استحکام اور مضبوطی لاؤ۔"

یہ فطری امر ہے کہ اگر کسی حکومت کے ذمہ دار افراد قوانین الٰہی کو اپنا محور بنا لیں اور اس سلسلہ میں علماء و حکماء سے برابر مشورے کیا کریں تو ملک و قوم نہ صرف یہ کہ گمراہی کا شکار نہ ہوگی بلکہ ملت و حکومت کو روز بروز استقلال اور پائداری حاصل ہوتی جائے گی۔ امامؑ نے اپنے ایک اور خطبہ میں الٰہی سنن و شریعت کا احیاء، ان کی حفاظت و نگہبانی اور بدعتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے سلسلہ میں حکام کی ذمہ داریوں کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:-

"فَاعْلَمْ اَنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ اِمَامٌ عَادِلٌ هُدِیَ وَهَدیٰ فَاَقَامَ سُنَّةً مَعْلُوْمَةً وَاَمَاتَ بِدْعَةً مَجْهُوْلَةً - وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ اِمَامٌ جَائِرٌ ضَلَّ وَضُلَّ بِهٖ فَاَمَاتَ سُنَّةً مَاْخُوْذَةً وَاَحْیٰی بِدْعَةً مَتْرُوْکَةً" (خطبہ نمبر ۱۶۴)

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کے نزدیک بہترین بندہ وہ حاکم عادل ہے جو خود ہدایت یافتہ ہے اور دوسروں کی بھی ہدایت کرتا ہے جانی بوجھی اور اچھی سنتوں کو قائم کرتا ہے اور جہالت کی پیدا کردہ مجہول بدعتوں کو توڑتا اور ان کا خاتمہ کرتا ہے۔ اور بلا شبہ اللہ کی نگاہ میں بدترین بندہ وہ ظالم حاکم ہے جو خود گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچتا ہے (پیغمبر اکرمؐ) کی قائم کردہ سنتوں کا خاتمہ کرتا ہے اور متروکہ بدعتوں کو زندہ کرتا جاتا ہے۔"

اب اس سلسلہ میں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کہ قوانین و احکام کا مرجع و مرکز کسے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر معیار کتاب و سنت ہو۔ اور پارلیمنٹ میں باصلاحیت افراد موجود ہوں نیز "ولایت فقیہ" کے اصول کے مطابق حکومت کا کام ایک صالح ولی فقیہ کی نگرانی اور سرپرستی میں آگے بڑھے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

اصل میں تمام مشکلات کی بنیاد یہ ہے کہ حکومت کا نظام غیر صالح، جاہل اور اقتدار پسند افراد کے ہاتھوں میں چلا جائے جو خود اپنی مرضی کے مطابق من موجی طریقہ پر جو چاہیں کریں اور الٰہی احکام و قوانین کو قدموں تلے روند ڈالیں۔

اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو پوری تاریخ میں حتی ملت اسلام پر حاکم موجودہ سیاستوں کی شکل میں صدیوں سے نسل انسانی معاشرہ کو دامن گیر رہا ہے۔ لہٰذا اس بات کی کوشش ہونا چاہیئے کہ کسی طرح اس عظیم مصیبت سے نجات حاصل کی جائے۔ اسلام سے آگاہ، صالح افراد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اسلام دشمن عناصر یا دین سے لاتعلق افراد اسلام کے نام پر حاکم نہ بن بیٹھیں کہ اسلام ہی کے نام پر اسے مٹانے کی کوششیں کرنے لگیں نتیجہ کے طور پر وہی خطرہ جو گذشتہ زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کی آبرو اور دین کی اصالت و حقانیت سے کھیلتا رہا ہے پھر در پیش ہو جائے۔ یہ نکتہ بہر حال ذہن میں رہنا چاہیئے کہ حق کی شناخت کا معیار افراد نہیں ہیں بلکہ حق خود افراد کی شناخت کا معیار ہے اور حق کی راہ و روش، کتاب و سنت اللہ اسلام کے حقیقی رہبروں کی سیرت و سیاست کے ذریعہ معین و مشخص ہو چکی ہے۔

۲۔ عدالتی مسائل اور قاضیوں کے خصوصیات

قضاوت کی اہمیت اور ایک قاضی کے خصوصیات و شرائط کیا ہیں، قضاوت کی اساس و بنیاد، اس کے مختلف پہلو، اس کا دائرۂ کار، اور اس امر سے متعلق و مربوط دیگر مسائل اسلام کی بنیادی کتابوں میں پوری وضاحت کے ساتھ جامع طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت علیؑ نے بھی اپنے ارشادات میں اس موضوع پر خاص تاکید فرمائی ہے۔ امامؑ نے مالک اشتر کو جو خط تحریر فرمایا ہے اس میں قاضیوں کے شرائط اور ان کی خصوصیات پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

"ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النَّاسِ أَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِي نَفْسِكَ مِمَّنْ لَا تَضِيقُ بِهِ الْأُمُورُ وَلَا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ وَلَا يَتَمَادَى فِي الزَّلَّةِ وَلَا يَحْصَرُ مِنَ الْفَيْءِ إِلَى الْحَقِّ إِذَا عَرَفَهُ وَلَا تُشْرِفُ نَفْسُهُ عَلَى طَمَعٍ وَلَا يَكْتَفِي بِأَدْنَى فَهْمٍ دُونَ أَقْصَاهُ وَأَوْقَفَهُمْ فِي الشُّبُهَاتِ وَآخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ وَأَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُرَاجَعَةِ الْخَصْمِ وَأَصْبَرَهُمْ عَلَى تَكَشُّفِ الْأُمُورِ وَأَصْرَمَهُمْ عِنْدَ

اِنْتَصَاحَ الْحُکْمِ مِمَّنْ لَا یَزْدَھِیْهِ اِطْرَاءٌ وَلَا یَسْتَمِیْلُهُ اِغْرَاءٌ وَاُولٰئِکَ قَلِیْلٌ ۔»

«لوگوں کے درمیان قضاوت اور فیصلے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرو جو تمہاری نگاہ میں رعایا میں سب سے بہتر ہو، ایسا شخص جو اس کام میں عاجز و مجبور نہ ہوتا ہو، اور طرفین کے رویہ سے غصہ میں نہ آتا ہو۔ اپنے اشتباہ اور لغزش پر اصرار و ہٹ دھرمی کا اظہار نہ کرتا ہو اور حق کو پہچان کر اس کی طرف رجوع کرنے اور اسے اختیار کرنے میں تامل یا طبیعت پر بوجھ نہ محسوس کرتا ہو۔ اس کا نفس طمع ولالچ کا شکار نہ ہوتا ہو اور بغیر پوری چھان بین کئے سرسری طور پر کسی معاملہ کو سمجھنے پر اکتفا نہ کرتا ہو۔ شبہ کے مقامات پر احتیاط سے کام لیتا ہو کافی اور اطمینان بخش دلائل کی بنیاد پر ہی فیصلہ کرتا ہو۔ شکایت کرنے والوں کے بار بار رجوع کرنے سے تھکتا اور دل تنگ نہ ہوتا ہو۔ معاملات کی تحقیق اور گتھیوں کو سلجھانے میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا ہو اور حق کو پہچان لینے کے بعد اس کے مطابق بے دھڑک فیصلہ سنا دیتا ہو۔ خوشامد و چاپلوسی اسے مغرور نہ بنا دے اور فریب اسے گمراہ نہ کر دے۔ البتہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔»

قاضیوں کی نگرانی اور زندگی کے مسائل سے مستغنی رکھنا

مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ خصوصیت سے قاضیوں اور عدالتی امور کے ذمہ دار افراد کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ولی امر یعنی حاکم کا فریضہ ہے کہ وہ قاضیوں پر پوری نگاہ رکھے رہے ان کے مسائل و مشکلات کو حل کرتا رہے۔ ان کے کام کی دیکھ بھال کرتا رہے اور اس اہم ترین گروہ کی نگرانی سے تھوڑی دیر کے لئے بھی چشم پوشی نہ کرے۔ بلکہ ہمیشہ انھیں زیر نظر رکھے۔ چنانچہ امام اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ثُمَّ اَکْثِرْ تَعَاھُدَ قَضَائِهِ وَافْسَحْ لَهُ فِی الْبَذْلِ مَا یُزِیْلُ عِلَّتَهُ وَتَقِلُّ مَعَهُ حَاجَتُهُ اِلَی النَّاسِ وَاَعْطِهِ مِنَ الْمَنْزِلَةِ

لَدَيْكَ مَا لَا يَطْمَعُ فِيهِ غَيْرُكَ مِنْ خَاصَّتِكَ. لِيَأْمَنَ بِذَلِكَ اغْتِيَالَ الرِّجَالِ لَهُ عِنْدَكَ - فَانْظُرْ فِي ذَلِكَ نَظَراً بَلِيغاً. فَإِنَّ هٰذَا الدِّينَ قَدْ كَانَ أَسِيراً فِي أَيْدِي الْأَشْرَارِ يُعْمَلُ فِيهِ بِالْهَوَىٰ وَتُطْلَبُ بِهِ الدُّنْيَا"

"مزید یہ کہ اس (قاضی) کے فیصلوں کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہا کرو اور اس کو بقدر کافی مال بخشو کہ وہ خلاف ورزی کے سلسلہ میں کوئی بہانہ تلاش نہ کر سکے اور لوگوں کا محتاج بن کر نہ رہے ۔ اسے اپنے نزدیک معزز و مقرب قرار دو تاکہ تمہارے دوسرے قریبی افراد اسے لالچ دینے یا ضرر پہنچانے کی ہمت نہ کر سکیں اور وہ تمہاری توجہ کی وجہ سے لوگوں کے فریب و سازش سے خود کو محفوظ سمجھے ۔ دیکھو اس سلسلہ میں کافی بالغ نظری سے کام لینا ۔ کیونکہ (اس سے) پہلے یہ دین شر پسند عناصر کے پنجوں میں اسیر رہ چکا ہے اور انہوں نے اسے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل اور دنیا طلبی کا ذریعہ بنا رکھا تھا ۔"

امامؑ کے اس قیمتی کلام میں بہت سے لطیف و ظریف نکتے موجود ہیں جن پر غور کیے بغیر سادگی سے گزر جانا ناانصافی ہو گی ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

(الف) نگرانی

ولی امر یعنی اسلامی نظام میں سب سے بلند مقام شخص کو قضاوت کے ذمہ دار افراد سے نہ صرف ہمیشہ رابطہ رکھنا چاہیئے بلکہ ان کے کاموں پر پوری نظر رکھنا چاہیئے اور ان کے سلسلہ میں صرف اطمینان و اعتماد پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ انسان خطاؤں سے محفوظ نہیں ہے اور چند لمحوں کی معمولی سی غفلت بھی بہت بڑے اور ناقابل تلافی نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے ۔

(ب) ضرورتوں کی تکمیل

قاضیوں اور حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد کی مادی و اقتصادی ضرورتوں اور زندگی کی دوسری احتیاجات کو پورا کرنا بڑی حساس اہمیت کا حامل ہے ۔ بعض لوگ جذبات و احساسات

کے اعتبار سے ضعیف و کمزور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اپنے مالی مشکلات، احتیاجات اور تنگیوں میں گرفتار ہو کر گمراہی کی طرف کھینچ لئے جائیں لہٰذا ایسے لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور ان کے مادی مشکلات کو دور کر کے ان کی گمراہی اور انحراف کی راہوں کو بند کیا جا سکتا ہے نیز رشوت اور غلط قسم کے لین دین اور حساب و کتاب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اقتصادی ضرورتیں بذات خود ایک حقیقت رکھتی ہیں اور حکومت پورے طور سے اس کی ذمہ دار ہے۔

(ج) قدر دانی

بعض لوگوں کو چاپلوسی، بے جا تعریفوں یا چرب زبانی کے ذریعہ رام ہی نہیں بلکہ گمراہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسے افراد اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے خود غرض اور فتنہ پرداز عناصر کی نظر میں رہتے ہیں اور بہت سے موقع پرست افراد محبت اور لگاوٹ کا جال بچھا کر ان کو اپنے آئینہ میں اتارتے ہیں جس کے نقصانات سے معاشرہ کا نظام محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا مافوق ذمہ داروں یا افسران بالا کو چاہیئے کہ اپنے ان ماتحت افراد سے ایسے روابط رکھیں جن سے وہ حقارت اور غربت کا احساس نہ کرنے پائیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شخصیتوں کو اہمیت و عزت بخشیں تاکہ منصب تفاوت کی آزادی اور مستقل مزاجی مجروح نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ اصولی طور پر لوگوں کی قدر دانی اور ان کے کاموں کی ہمت افزائی اور تشویق خود ایک مستقل اصول ہے، کہ حدیث میں بھی ہے:

"مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْمَخْلُوقَ لَمْ يَشْكُرِ الْخَالِقَ"۔

"جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، خالق کا شکر گزار بھی نہیں ہو سکتا۔"

حضرت علیؑ کے اقوال میں ایسے افراد کی قدر دانی اور تعریف و توصیف کے نمونے موجود ہیں جنھوں نے خوش اسلوبی سے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں انجام دی ہیں۔ اس سلسلہ میں مناسب موقع پر تفصیل سے تذکرہ ہوگا۔ بہر حال ان اقوال کو ملک کے ذمہ دار افراد کے لئے نمونۂ عمل ہونا چاہیئے۔

(د) عدالت کی آزادی

آخر میں امامؑ نے اپنے کلام میں اہل شر کی حکومت کے دوران دین کی اسیری اور قید و بند کا تذکرہ فرمایا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ملک کے ذمہ دار افراد منجملہ محکمۂ عدلیہ کے عہدے دار اگر مستقل اور خود مختار ہوں یا انھیں گمراہی و خلاف ورزی کی طرف کھینچا جا سکتا ہو اور اثر و رسوخ، سفارش و رشوت یا لالچ، تعریف و خوشامد اور ڈرانے اور دھمکانے والے عناصر ان پر اثر انداز ہو سکتے ہوں تو گویا دین ان لوگوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو کر رہ جائے گا اور ہر طرح کے قوانین و احکام کے اجراء کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری ملت اسیری اور غلامی کا شکار ہو جائے گی۔ اس کی بہت سی مثالیں ظلم و استبداد کے زیر تسلط ممالک کے عدالتی نظاموں حتیٰ ان ہی طاقتوں کی اسیر نام نہاد بین الاقوامی حقوق کو عدالتوں میں بے شمار مواقع پر دیکھنے کو ملی ہے اور ملتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قضاوت اور حقوق و قانون کے مسئلہ سے متعلق اسلام کی عمیق نظری اور باریک بینی کو پہلے سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں، لہٰذا حکومت کے ذمہ دار افراد کا فریضہ ہے کہ جس طرح اسلام نے اس کی تاکید کی ہے حقوق و قضاوت کی خود مختاری اور سالمیت کی حفاظت کی پوری کوشش کریں، ساتھ میں اس کا بھی خیال رکھیں کہ عدالت کی اس آزادی میں گمراہ کن، غیر سالم اور نقصان دہ روشیں نفوذ نہ کرنا پائیں، کیونکہ یہ امر اسلام اور مسلمانوں کے لئے حیاتی قدر و قیمت کا حامل ہے۔

۳۔ اجرائی رکن اور ملت کا کردار

نظام حکومت کے ارکان میں سے ایک قانون کو نافذ کرنے والا رکن بھی ہے جس میں وزراء، اس کے معاونین، نائبین، سکریٹری اور منشی سے لے کر معمولی خدمت گزاروں تک سیکڑوں، ہزاروں افراد حکومت کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ ان افراد کا انتخاب و تقرر خود ایک مسئلہ ہے اور ان مختلف صنف کے افراد اور حکومت کے باہمی روابط اکثر ایک دوسرے پر اور خود معاشرہ پر ایک دوسرا مسئلہ۔ امام علیہ السلام نے تفصیل کے ساتھ ان دونوں پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے ملاحظہ ہو ــــــــ

وَاعْلَمْ اَنَّ الرَّعِيَّةَ طَبَقَاتٌ لَا يَصْلُحُ بَعْضُهَا اِلَّا بِبَعْضٍ، وَلَا غِنَىٰ بِبَعْضِهَا عَنْ بَعْضٍ فَمِنْهَا جُنُوْدُ اللّٰهِ، وَمِنْهَا كُتَّابُ الْعَامَّةِ وَالْخَاصَّةِ وَمِنْهَا قُضَاةُ الْعَدْلِ، وَمِنْهَا عُمَّالُ الْاِنْصَافِ وَالرِّفْقِ، وَمِنْهَا اَهْلُ الْجِزْيَةِ وَالْخَرَاجِ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ وَمُسْلِمَةِ النَّاسِ، وَمِنْهَا التُّجَّارُ وَاَهْلُ الصِّنَاعَاتِ وَمِنْهَا الطَّبَقَةُ السُّفْلَىٰ مِنْ ذَوِي الْحَاجَةِ وَالْمَسْكَنَةِ، وَكُلٌّ قَدْ سَمَّى اللّٰهُ لَهُ سَهْمَهُ وَوَضَعَ عَلَىٰ حَدِّهِ فَرِيْضَةً فِيْ كِتَابِهِ اَوْ سُنَّةِ نَبِيِّهِ ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ ـ عَهْدًا مِنْهُ عِنْدَنَا مَحْفُوْظًا (خط نمبر ۵۳)

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں، جن کی فلاح و بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اور وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں۔ یہ طبقے کچھ اس طرح ہیں: خدا کے سپاہی (لشکر) عمومی و خصوصی شعبوں کے منشی، عدالتوں کے قاضی، امن و انصاف قائم کرنے پر مامور افراد، ذمی کفار اور مسلمانوں سے جزیہ خراج اور دیگر ٹیکس وصول کرنے والے، تجار اور اہل صنعت و حرفت اور معاشرہ کا غریب و محتاج اور نچلا طبقہ۔ خداوند عالم نے ہر ایک کا حق معین کر دیا ہے اور کتاب خدا و سنت پیغمبرؐ میں اس کی حد بندی کر دی ہے۔ جو ایک عہد اور آئین نامہ کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

چونکہ اسلام کے سیاسی نظام میں، حکومت، ملت سے الگ نہیں ہے اور رعایا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے معاشرہ کا پست اور محنت کش طبقہ ہی مراد لیا جائے۔ بلکہ معاشرہ کے پست طبقے بھی اس نظام میں ایک حساس جگہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کلام امامؑ میں بلا استثنار معاشرہ کے تمام طبقات کا ذکر موجود ہے اور جس طرح مسلح فوجوں نیز عدالتی حکام کا ذکر کیا گیا ہے یوں ہی کاریگروں، مزدوروں، کسانوں، تاجروں اور محروم و فقیر افراد کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سب کے لئے مخصوص حدود و حقوق بھی معین کئے گئے ہیں۔ جس کی

تفصیل آئندہ سامنے آئے گی۔

امام علیہ السلام نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے حکومت و مملکت کے نظام میں مذکورہ بالا تمام طبقوں کی معاشرہ میں حیثیت و اہمیت نیز ایک دوسرے کے ساتھ ان کے باہمی ارتباط کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

(الف) سپاہ یا فوج

"فَالجنودُ بِاذنِ اللهِ حصونُ الرَّعیة، وَزَینُ الوُلاة، وَعزُّ الدِّین، وسبلُ الامن ولیس تقومُ الرَّعیة اِلّا بِهم"

"فوج خدا کے حکم سے ملت کا مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ، حکام کی زینت و آبرو، دین کے لئے مایۂ عزت و افتخار اور معاشرہ میں امن و امان قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ رعایا کو بغیر اس کے استقلال و استحکام نہیں حاصل ہو سکتا۔"

(ب) دفاعی بجٹ

"ثمَّ لاقوام لِلجنودِ اِلا بما یخرجُ اللهُ لهم من الخراج الّذی یقوون بِهِ علی جهاد عدوهم ویعتمدون علیهِ فیما یصلحهم ویکون من وراء حاجتهم"

"اور پھر فوج کا نظم و استحکام بھی ان مالیات یا ٹیکسوں اور آمدنیوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا جو خدا نے ان کے اختیار میں دے رکھے ہیں کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے دشمن سے جہاد کریں اور خود کو قوی اور ساز و سامان سے آراستہ کریں نیز اپنی ضرورتیں پوری کریں۔"

(ج) قاضی اور دیگر کارکنان حکومت

"ثُمَّ لا قوامَ لِهذین الصنفین اِلّا بالصنفِ الثالثِ من القضاة وَالعمّال وَالکتاب لِما یحکمون من المعاقد ویجمعون مِن المنافع ویؤتمنون علیه مِن خواص الامور وعوامها"

"پھر مذکورہ بالا ان دو صنفوں یعنی فوج اور دفاعی بجٹ کے استحکام کا انحصار تیسرے گروہ پر ہے جن سے مراد قضاۃ، حکومت کے کارکنان اور منشی ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ باہمی معاہدوں کو محکم و استوار کرتے ہیں، منافع اور آمدنیوں کو جمع کرتے ہیں اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے امور میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔"

(د) تجار اور اہل صنعت و حرفت

"وَلَا قِوَامَ لَهُمْ جَمِيعاً اِلَّا بِالتُّجَّارِ وَذَوِي الصِّنَاعَاتِ فِيمَا يَجْتَمِعُونَ عَلَيْهِ مِنْ مَرَافِقِهِمْ وَيُقِيمُونَ مِنْ اَسْوَاقِهِمْ وَيَكْفُونَهُمْ مِنَ التَّرَفُّقِ بِاَيْدِيهِمْ مَا لَا يَبْلُغُهُ رِفْقُ غَيْرِهِمْ"

"اور ان سب کا انحصار تاجروں اور اہل صنعت و حرفت پر ہے، جو کسب و کار کے بازاروں اور کارخانوں میں جمع ہوتے ہیں اور اپنی آمدنی و محنت و کاوش سے ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں (اور انھیں آسودہ کر دیتے ہیں) کہ دوسروں کی آمدنی اس کی تلافی کے لئے کافی نہیں ہوتی"۔

(ھ) کمزور اور نچلا طبقہ

"ثُمَّ الطَّبَقَةُ السُّفْلَى مِنْ اَهْلِ الْحَاجَةِ وَالْمَسْكَنَةِ الَّذِينَ يَحِقُّ رِفْدُهُمْ وَمَعُونَتُهُمْ وَفِي اللّٰهِ لِكُلٍّ سَعَةٌ وَلِكُلٍّ عَلَى الْوَالِي حَقٌّ بِقَدْرِ مَا يُصْلِحُهُ، وَلَيْسَ يَخْرُجُ الْوَالِي مِنْ حَقِيقَةِ مَا اَلْزَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْاِهْتِمَامِ وَالْاِسْتِعَانَةِ بِاللّٰهِ وَتَوْطِينِ نَفْسِهِ عَلَى لُزُومِ الْحَقِّ وَالصَّبْرِ عَلَيْهِ فِيمَا خَفَّ عَلَيْهِ اَوْ ثَقُلَ"

"اور آخر میں معاشرہ کا وہ نچلا طبقہ ہے جو محتاج اور تہی دست افراد پر مشتمل ہے۔ اور جن کی ضرورتیں اعانت اور مالی امداد کے ذریعہ پوری کی جانی چاہیئے۔ خداوند عالم نے معاشرہ کے ان طبقوں میں ہر ایک کے لئے ایک شاہراہ کھول رکھی ہے اور ان کی حیثیت کے مطابق سب کا حکومت اور والی پر حق مقرر فرمایا ہے۔

اور حاکم اپنے اس فریضہ سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب اس سلسلہ میں عزم

وحوصلہ کے ساتھ پوری جدوجہد سے کام لے، خداوند عالم سے نصرت کا طلبگار رہے حق پر اپنے آپ کو پوری طرح جمائے رہے اور صبر اختیار کرے چاہے اس کی یہ ذمہ داریاں سبک ہوں یا سنگین ۔

حکومت اور معاشرے کے ان بنیادی ارکان کی اہمیت وحیثیت سے متعلق اس اجمالی اور جامع بیان کے بعد کلام امامؑ کی چند دوسری خصوصیات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہم یہاں ان میں سے بعض اہم نکات کا ذکر کرتے ہیں :-

خراج اور مالیات (ٹیکس)

امام علیہ السلام نے بازاروں اور کارخانوں کی آمدنیوں کو جو حکومت کے مالی "اعتبار" کی حیثیت سے فوج کے بجٹ، عدالتی محکموں اور دیگر حکومتی اداروں میں کام کرنے والے افراد نیز معاشرہ کے محروم طبقہ کی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تاجروں اور صاحبانِ صنعت وحرفت کی آمدنی ہی حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس نتیجہ سے دو بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں جنھیں ہم حسبِ ذیل ذکر کرتے ہیں :-

(۱) ـــــ جو آمدنیاں ملک کے روزمرہ میں حکومت کے اعتبار کی حیثیت رکھتی ہیں، قطعی طور پر وہ آمدنیاں نہیں ہیں جو صرف شرعی رقومات (مثلاً خمس وزکوٰۃ) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہو، لہٰذا یہ لفظ "خراج" جو فقہ وحدیث کی عبارتوں، منجملہ امامؑ کے اسی منشور میں آیا ہے اس سے مراد شرعی رقومات سے بالاتر ہی کوئی چیز ہونی چاہیئے اور جسے آمدنی پر لگنے والا ٹیکس کہا جا سکتا ہے جو وقت کے تقاضوں، حکومت اسلامی کی صوابدید اور ملکی بجٹ کے مطابق ہونا چاہیئے ۔

(البتہ) اگر قومی آمدنی اور ضرورت کے پیشِ نظر ولی فقیہ کی اجازت سے استعمال کی جانے والی شرعی رقومات بھی ملکی بجٹ کو پورا نہ کر سکیں تو مالیات اور خراج کی صورت میں ادا کئے جانے والے ٹیکس بجٹ کے خسارہ اور ملک کی ضرورت کے مطابق مقرر کئے جائیں گے، جس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے ۔)

(۲) ـــــــ جس طرح حکومت ملکی مخارج کے ایک بڑے حصہ کا بوجھ ملت کے کاندھوں پر ڈالتی ہے اور تاجروں نیز اہل صنعت وحرفت پر خصوصی ٹیکس مقرر کرتی ہے تو حکومت کو چاہیے کہ اس کے عوض ہر ممکن طریقہ سے ان کی حمایت کی بھی کوشش کرے اور عمومی طور پر پیداوار کی سطح کو بلند کرنے کی غرض سے ان کے لئے آسانیاں اور ضروری وسائل وامکانات فراہم کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ حکومت اور ملت کے افراد کا باہمی تعاون ہے جو اقتصادی اعتبار سے خود ملت اور حکومت کی بنیادی وحیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے، اور یہ حقیقت امامؑ کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہی ہے، چنانچہ آپ کے مذکورہ خط میں دوسرے مقامات پر بھی ہمیں یہ نکات نظر آتے ہیں۔

لائق اور نالائق وزرار

"اِنَّ شَرَّ وُزَرائِكَ مَنْ كانَ لِلْاَشْرارِ قَبْلَكَ وَزيراً وَمَنْ شَرِكَهُمْ فِي الْآثامِ فَلا يَكُونَنَّ لَكَ بِطانَةً فَاِنَّهُمْ اَعْوانُ الْاَثَمَةِ وَاِخْوانُ الظَّلَمَةِ وَاَنْتَ واجِدٌ مِنْهُمْ خَيْرَ الْخَلَفِ مِمَّنْ لَهُ مِثْلُ آرائِهِمْ وَنَفاذِهِمْ وَلَيْسَ عَلَيْهِ مِثْلُ آصارِهِمْ وَاَوْزارِهِمْ آثامِهِمْ مِمَّنْ لَمْ يُعاوِنْ ظالِماً عَلى ظُلْمِهِ وَلا آثِماً عَلى اِثْمِهِ اُولئِكَ اَخَفُّ عَلَيْكَ مَؤُونَةً وَاَحْسَنُ لَكَ مَعُونَةً وَاَحْنى عَلَيْكَ عَطْفاً، وَاَقَلُّ لِغَيْرِكَ اِلْفاً فَاتَّخِذْ اُولئِكَ خاصَّةً لِخَلَواتِكَ وَحَفَلاتِكَ."

"تمہارے بدترین وزرا وہ ہیں جو تم سے پہلے کے ظالم حکام کی وزارت میں رہ چکے ہیں اور ان کے جرائم میں شریک رہے ہیں۔ پس خبردار! ایسے لوگ تمہارے رازدار اور مقرب نہ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ لوگ تباہ کاروں کے شریک کار اور ظالموں کے منہ بولے بھائی ہیں۔ جبکہ تم یہ کر سکتے ہو کہ ان کی جگہ ایسے صالح افراد کو معین کرو جو اس منصب کے لائق ضروری آگاہی اور تجربہ رکھتے ہوں جن کے دامن گذشتہ لوگوں کی طرح جرائم، گناہوں اور گمراہیوں سے آلودہ نہ ہوں اور جنھوں نے ستم کاروں اور خطاکاروں کے

ساتھ تعاون بھی نہ کیا ہو۔ ایسے لوگ کم خرچ اور مختصر معاوضہ پر بہتر خدمت انجام دیتے ہیں، پوری دلجمعی اور گہرے احساسات کے ساتھ تم سے ملتے ہیں اور دوسروں سے کم ہی دل لگاتے ہیں۔ پس انہی لوگوں کو اپنے خفیہ و محرمانہ جلسوں اور مخصوص محفلوں کے لئے منتخب کرو۔

"ثُمَّ لْيَكُنْ آثَرُهُمْ عِنْدَكَ أَقْوَلَهُمْ بِمُرِّ الْحَقِّ لَكَ، وَأَقَلَّهُمْ مُسَاعَدَةً فِيمَا يَكُونُ مِنْكَ مِمَّا كَرِهَ اللَّهُ لِأَوْلِيَائِهِ، وَاقِعاً ذَلِكَ مِنْ هَوَاكَ حَيْثُ وَقَعَ وَالْصَقْ بِأَهْلِ الْوَرَعِ وَالصِّدْقِ ثُمَّ رُضْهُمْ عَلَى أَلَّا يُطْرُوكَ وَلَا يَبْجَحُوكَ بِبَاطِلٍ لَمْ تَفْعَلْهُ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْإِطْرَاءِ تُحْدِثُ الزَّهْوَ وَتُدْنِي مِنَ الْعِزَّةِ"

"اور ان میں بھی اس شخص کو زیادہ ترجیح دو جو حق بات کو چاہے جتنی کڑوی ہو، تم سے کھل کر بیان کردے۔ اور کسی ایسے کام میں تمہارے ساتھ تھوڑا سا بھی تعاون کرنے پر تیار نہ ہو، جسے اللہ اپنے اولیاء کے لئے پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ کام تمہاری خواہش کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ پرہیزگار اور سچے افراد سے گہرے روابط اور نزدیکی تعلقات رکھو اور انھیں اس کا عادی بناؤ کہ تمہاری بیجا تعریفیں کرکے اور تمہارے سر کسی ایسے کارنامہ کا سہرا باندھ کر تمہیں فریب نہ دیں کیونکہ یہ چاپلوسی کی باتیں غرور و تکبر پیدا کرتی ہیں۔"

مذکورہ بالا کلام کی روشنی میں ایک اسلامی نظام کے لئے وزیروں کے انتخاب اور ان کے خصوصیات سے متعلق چند حسب ذیل نکات قابل غور اور لائق توجہ ہیں۔

(الف) عدم وابستگی و بے داغ ماضی

وزراء اور حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد جو غیر صالح اور ناجائز حکومتوں سے وابستہ رہے ہیں، اسلامی حکومت میں وزارت یا دوسرے عہدوں پر کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ ایک طرف تو ان پر اس لئے اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ ظالموں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون ان کی عادت ثانیہ بن چکی ہے، اور ان کی اس دیرینہ عادت کو بمشکل ہی ان سے دور کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ یہ لوگ ناقابل اعتبار ہوچکے ہیں لہٰذا ہمیشہ عوام کی آنکھوں

کا کانٹا اور ان کی روح میں گرہ بن کر کھٹکتے رہیں گے ۔ مزید یہ کہ یہ لوگ اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے صالح افراد کو جذب بھی نہیں کر سکتے ۔ نتیجہ میں ملک کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور گمراہی و کمزوری کا شکار ہو جائے گا ۔

(ب) وزیروں کا اخلاق

وزراء ، ان کے معاون اور حساس عہدوں کے ذمہ دار بلکہ حکومت کے تمام اہم عہدوں پر کام کرنے والے افراد ایسے ہوں جن کا ماضی خراب نہ ہو ، وہ کم توقع ، محنتی ، رحم دل اور با وفا ہوں کیونکہ یہ صفات حکومت کو استحکام بخشنے ، نظام کو پائدار بنانے اور معاشرہ کے عمومی مصالح کے حق میں اہم کردار ادا کریں گے ۔ ان خصوصیات کے حامل افراد حکومت کے رازدار اور دشمنوں کے ساتھ ضرر رساں روابط کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔

(ج) صاف گوئی

حکومت کے کارکنان ، چاہے وہ وزراء ہوں یا دیگر عہدہ دار اور اسلامی نظام میں کام کرنے والے افراد ، ان کا دامن تملق و چاپلوسی کی عادت سے پاک ہونا چاہیئے ۔ وہ نہ صرف بے جا تعریفوں اور مدح سرائیوں سے پرہیز کریں بلکہ حق کو صاف صاف بیان کر دیں چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو اپنے سے بڑے عہدہ دار یا افسر کا رعب و داب انھیں حق بات کہنے سے روک نہ دے ، کیونکہ حقائق کا بیان کرنا ایک فریضہ ہے ، خاص طور سے جبکہ اس سے ملک و قوم کی بھلائی اور بہتری بھی وابستہ ہو ۔

(د) خوشامد سے پرہیز

اور آخری نکتہ یہ ہے کہ حاکم کا طرز عمل ایسا ہونا چاہیئے جس سے اس کے ساتھ کام کرنے والوں اور ماتحتوں میں خوشامد و چاپلوسی کی عادت پیدا نہ ہونے پائے ۔ اسے چاہیئے کہ سیاسی طور پر تقویٰ و پرہیز گاری کے ذریعہ اپنی خود خواہی اور خود پسندی کی عادت کا گلا گھونٹ دے اور خوشامد پسندی کی خو کو کچل ڈالے ، سازگار اور مفید تنقیدوں کے لئے ماحول پیدا کرے اور پوری ریاضت و جد وجہد کے ذریعہ خوشامد و چاپلوسی جیسی ذلیل خصلت سے مقابلہ کرتا رہے ، جو انسانوں کی تباہی کا باعث ہوتی ہے ۔

امام علیہ السلام کے کلام گہربار میں جو بات بیان ہوئی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے آپ نے اپنی حکومت میں عملی طور پر ثابت بھی کیا ہے۔ حکومت اور طاقت کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی عظیم روح میں وہ خطرناک اثرات پیدا نہ ہو سکے۔ یہ وہ شان ہے جو خداوند عالم نے اپنے اولیا کو عطا کی ہے اور حکومت کے ذمہ دار افراد کو اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کرنا چاہیے۔

دیگر ملازمین کا انتخاب

اس عہدنامہ کے ایک دوسرے حصہ میں امام علیہ السلام نے حکومت کے دیگر عمال و ملازمین کے انتخاب کی جانب اشارہ فرمایا ہے، اور ان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لائق اور باصلاحیت افراد کے انتخاب کے سلسلہ میں یوں راہنمائی فرمائی ہے:۔

"ثُمَّ انْظُرْ فِي أُمُورِ عُمَّالِكَ فَاسْتَعْمِلْهُمْ اِخْتِبَاراً وَلَا تُوَلِّهِمْ مُحَابَاةً وَأَثَرَةً فَإِنَّهُمَا جِمَاعٌ مِنْ شُعَبِ الْجَوْرِ وَالْخِيَانَةِ وَتَوَخَّ مِنْهُمْ أَهْلَ التَّجْرِبَةِ وَالْحَيَاءِ مِنْ أَهْلِ الْبُيُوتَاتِ الصَّالِحَةِ وَالْقَدَمِ فِي الْإِسْلَامِ الْمُتَقَدِّمَةِ. فَإِنَّهُمْ أَكْرَمُ أَخْلَاقاً وَأَصَحُّ أَعْرَاضاً وَأَقَلُّ فِي الْمَطَامِعِ إِشْرَاقاً وَأَبْلَغُ فِي عَوَاقِبِ الْأُمُورِ نَظَراً"

"پھر اپنے عہدہ داروں اور کارندوں کے بارے میں خوب غور کرو اور دقیق آزمائش کے بعد خود آرائی اور جانبداری سے دور رہ کر انھیں عہدوں کے لئے انتخاب کرو، کیونکہ یہ دونوں صورتیں ظلم و ستم اور خیانت کو ہوا دیتی ہیں۔ لوگوں میں سے آزمودہ کار باتجربہ اور حیادار افراد کو منتخب کرو جو نیک اور صالح و اسلام لانے والوں میں پیش قدم خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں، کیونکہ یہ لوگ بلند اخلاق اور قابل اعتماد ہیں۔ طمع و لالچ کی طرف کم جھکتے ہیں اور نتائج و انجام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔"

تجربہ، آزمودہ کاری، غیرت مندی، خاندانی نجابت، درخشاں دینی ماضی، خوش

اخلاقی، شرافت، قناعت، عزت نفس اور مآل اندیشی ایسے اصول ہیں جنھیں امامؑ نے لوگوں کے انتخابات کے لئے معیار قرار دیا ہے۔ اس کے بعد حضرتؑ ان کارگزاروں اور ملازموں کے سلسلہ میں حکومت کے حکام کی ذمہ داریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"ثُمَّ اَسْبِغْ عَلَيْهِمُ الْاَرْزَاقَ فَاِنَّ ذٰلِكَ قُوَّةٌ عَلَيْهِمْ عَلٰى اسْتِصْلَاحِ اَنْفُسِهِمْ وَغِنًى لَهُمْ عَنْ تَنَاوُلِ مَا تَحْتَ اَيْدِيْهِمْ، وَحُجَّةٌ عَلَيْهِمْ اِنْ خَالَفُوْا اَمْرَكَ اَوْ ثَلَمُوْا اَمَانَتَكَ"

"اس کے بعد ان کی روزی و معاش (تنخواہیں) انھیں بحد کافی دو جس سے یہ امکان پیدا ہوگا کہ وہ اپنی اصلاح کے سلسلہ میں کوشاں رہیں گے اور ان کے زیر نگیں جو اموال اور امانتیں ہیں ان میں خیانت سے بے نیاز رہیں گے۔ ساتھ ہی یہ امر تمہاری طرف سے ان کے اوپر حجت تمام کردے گا کہ تمہارے حکم کی مخالفت یا امانت میں خیانت کی صورت میں وہ کوئی عذر پیش نہ کرسکیں گے۔"

ساتھ ہی کارگزاروں کے کام اور ان کے اعمال و کردار کی نگرانی کو بھی حکام کی ایک ذمہ داری کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

نگرانی اور جانچ پڑتال

"ثُمَّ تَفَقَّدْ اَعْمَالَهُمْ وَابْعَثِ الْعُيُوْنَ مِنْ اَهْلِ الصِّدْقِ وَالْوَفَاءِ عَلَيْهِمْ فَاِنَّ تَعَاهُدَكَ فِي السِّرِّ لِاُمُوْرِهِمْ حَدْوَةٌ لَهُمْ عَلٰى اسْتِعْمَالِ الْاَمَانَةِ وَالرِّفْقِ بِالرَّعِيَّةِ۔ وَتَحَفَّظْ مِنَ الْاَعْوَانِ فَاِنْ اَحَدٌ مِنْهُمْ بَسَطَ يَدَهُ اِلَى الْخِيَانَةِ اجْتَمَعَتْ بِهَا عَلَيْهِ عِنْدَكَ اَخْبَارُ عُيُوْنِكَ اِكْتَفَيْتَ بِذٰلِكَ شَاهِدًا فَبَسَطْتَ عَلَيْهِ الْعُقُوْبَةَ فِيْ بَدَنِهِ وَاَخَذْتَهُ بِمَا اَصَابَ مِنْ عَمَلِهِ، ثُمَّ نَصَبْتَهُ بِمَقَامِ الْمَذَلَّةِ وَوَسَمْتَهُ بِالْخِيَانَةِ وَقَلَّدْتَهُ عَارَ التُّهَمَةِ"

"اس کے بعد ان کی کارگزاریوں کی دیکھ بھال اور نگرانی رکھو۔ سچے اور وفادار افراد کو

بطور ناظران کے اوپر معین کرو کیونکہ ان کی خفیہ نگرانی اور جانچ پڑتال انھیں امانت کی رعایت اور لوگوں کے ساتھ نرم روی پر مجبور کر دے گی۔ اپنے مددگاروں اور معاونوں سے خود کو محفوظ رکھنا، اگر ان میں سے کوئی خیانت کا مرتکب ہو اور تمہارے خفیہ مخبر متفقہ طور پر اس کی خیانت کی خبر دیں تو یہ گواہی تمہارے لئے کافی ہے کہ اس کی تنبیہ کرو۔ اس نے خیانت سے جو کچھ سمیٹا ہے اس کا مواخذہ کرو۔ اسے ذلیل و خوار کر دو، خیانت کا داغ اس کی پیشانی پر ثبت کر دو اور ننگ و رسوائی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دو"

یہاں حاکم کی ہوشیاری کے ذریعہ سازشوں اور غلط کاریوں کی پہچان نیز براہ راست یا کسی اور ذریعہ سے ماتحت عملہ کی مکمل نگرانی، دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کی ضرورت اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ یہ اقدام ملکی امور کے چلانے اور حکومت کو پائداری واستحکام عطا کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

وجۂ افتخار

"ہمیں فخر ہے کہ ہم اس مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد
خدا کے حکم سے رسول خدا (ص) نے رکھی ہے اور انسان کو
غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی ذمہ داری، ہر قسم کی قیدو
بند سے آزاد (خدا کے) بندہ امیرالمومنین علی(ع) بن ابی طالب کو
سونپی گئی ہے . . . ہمیں فخر ہے کہ ائمۂ معصومین(ع)، علی(ع) بن ابی
طالب سے منجی بشریت حضرت مہدی صاحب الزمان
علیہم آلاف التحیۃ والسّلام تک جو خدائے قادر کی قدرت و
توانائی سے زندہ اور تمام امور کے نگراں ہیں، ہمارے امام ہیں۔"

امام خمینیؒ کے وصیت نامہ سے اقتباس

امامت
قرآن کی روشنی میں
سوال و جواب

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

سوال: معصوم کا کیا مطلب ہے؟ یہ ہماری شیعہ منطق کا ساختہ و پرداختہ کوئی مفہوم ہے یا اس کی کچھ بنیادیں ہیں اور ہم نے انہیں پروان چڑھا کر بہتر بنایا ہے؟ اصولی طور پر کیا معصوم اس شخص کو کہتے ہیں جو گناہ نہ کرے۔ یا اسے کہتے ہیں جو گناہ کے علاوہ کوئی اشتباہ یا غلطی بھی نہ کرتا ہو؟

ہم بیس سال پہلے میرزا ابوالحسن خان فروغی مرحوم کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے یہ بزرگوار خاص طور سے عصمت کے مسئلہ میں خصوصی اور وسیع مطالعہ اور خاص عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اس موضوع پر بہترین انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے اگرچہ ہم اس وقت ان کی اسّی فی صد گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس میں سے بیس فیصدی جو سمجھتے تھے، اس کے مطابق وہ عصمت کی ایک دوسرے انداز میں تعریف کرتے تھے وہ فرماتے تھے، معصوم وہ نہیں ہے جو گناہ نہ کرے۔ ہماری نگاہ میں بہت سے ایسے افراد ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں گناہ ہی نہیں کیا۔ لیکن انہیں معصوم نہیں کہتے۔ اس وقت ہمیں اس فکر سے سروکار نہیں ہے۔ آقائے مطہری کے پاس یقیناً اس کا جواب ہوگا کہ معصوم سے کیا مراد ہے؟ اگر معصوم وہ شخص ہے جس سے کبھی کوئی غلطی یا بھول چوک

بھی نہ ہوئی ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ ائمہ علیہم السلام میں سے صرف دو حضرات مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے : حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ اور وہ بھی بڑی مختصر مدت کے لئے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان حضرات سے خلافت کے معاملات اور حکومت چلانے کے سلسلہ میں بہت سے اشتباہ ہوئے اور تاریخی نقطۂ نظر سے ان اشتباہات اور غلطیوں میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں ۔ اور یہ بات معصوم کی مذکورہ بالا تعریف سے کسی طرح میل نہیں کھاتی ۔

مثال کے طور پر امام حسن علیہ السلام کا عبیداللہ بن عباس کو معاویہ سے جنگ کے لئے مامور کرنا ۔ یا خود حضرت علی علیہ السلام کا عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کرنا ۔ اگر آپ جانتے ہوتے کہ یہ شخص اس قدر رسوائی کا باعث ہوگا اور ایسی بد عملی کا مظاہرہ کرے گا تو یقیناً آپ یہ کام نہ کرتے ۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ آپ حقیقت سے واقف نہ تھے یعنی پہلے آپ کا خیال یہ تھا کہ میں نے جسے انتخاب کیا ہے وہ اس کام کے لئے بہترین شخص ہے ، لیکن بعد میں وہ شخص غلط نکلا ۔ اور اگر حضرتؑ کے دورۂ حکومت سے متعلق مزید تحقیق کی جائے تو یقیناً اس طرح کے اور بھی مسائل نظر آئیں گے اور تاریخی لحاظ سے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں ہے ۔ لیکن یہ بات عصمت کی اس تعریف سے بالکل میل نہیں کھاتی

اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ بحث کرنے کا یک طرفہ انداز یعنی سارے موافق حضرات کا کسی بحث میں حصہ لینا زیادہ مفید نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعی جب انسان کوئی عقیدہ رکھتا ہے تو اسے دوست بھی رکھتا ہے اور اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اپنے اس عقیدہ کے خلاف کچھ بھی سُنے ۔ خاص طور سے ہم جو بچپن سے ہی شیعیت اور خاندان علیؑ ابن ابی طالب سے محبت اپنے دل میں رکھتے آئے ہیں اور کبھی اس کے خلاف تنقید نہیں سنی ہے ۔ شاید خود دین و اصولِ دین یہاں تک کہ توحید و خدا پرستی سے متعلق اعتراضات یا تنقیدیں تو آسانی سے سن لی ہوں لیکن تشیع اور ائمہ علیہم السلام پر تنقید یا کسی کا ان حضرات کی زندگی کرا ہوئے یہ کام کیوں کیا اور وہ کیوں نہ کیا ، سے ہمارے کان آشنا نہیں ہیں ، اسی وجہ سے اگر کوئی مثال کے طور پر امام حسنؑ کے عمل یا امام حسینؑ کے اقدام پر اعتراض کرے تو ہمیں بہت

شاق گزرتا ہے۔

لیکن مثال کے طور پر یہ آیت جسے آقائے مطہری نے پہلے جلسہ میں اور اس جلسہ میں موضوع قرار دیا ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے "وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات ادا کرتے ہیں"۔ اس کے بعد آپ نے استدلال فرمایا کہ یہ آیت اس واقعہ کے تحت جس میں حضرت علیؑ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی سائل کو دی تھی، سوائے حضرت علیؑ کے کسی اور کے بارے میں نہیں ہے۔ میری نظر میں یہ بات کچھ منطقی اور معقول نہیں لگتی، کیونکہ اول تو ہم نے امیرالمؤمنینؑ کی زندگی کے بارے میں یہ پڑھا اور سنا ہے کہ نماز کی حالت میں آپ کی توجہ خداوند عالم کی جانب اس قدر ہوا کرتی تھی کہ گرد و پیش کے لوگوں سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وضو کرتے وقت بھی اگر آپ کے سامنے سے لوگ گزر جاتے تھے تو آپ انھیں پہچان نہیں پاتے تھے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز کی حالت میں ایسے شخص کے حواس اس قدر دوسروں کی طرف متوجہ ہوں کہ سائل مسجد میں وارد ہوتا ہے، سوال کرتا ہے، کوئی اسے کچھ نہیں دیتا اور حضرت اپنی انگوٹھی اتار کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ سائل کو پیسے دینا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے۔ سائل کو پیسہ دینا اس قدر اہم نہیں ہے کہ انسان اپنی نماز کو کم از کم باطنی اور روحانی اعتبار سے ہی ناقص کر دے یا اس میں خلل پیدا کرے؟

اس کے علاوہ زکات کا تعلق انگوٹھی سے نہیں ہے اور فقہائے شیعہ کے فتووں کے مطابق زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں شامل بھی نہیں ہے۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ افراد جو اس سلسلہ میں کٹر ہیں اس موضوع کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے یہ بھی فرما گئے ہیں کہ یہ انگوٹھی بہت زیادہ قیمتی تھی۔ جبکہ حضرت علیؑ نے قیمتی انگوٹھی نہیں پہنی۔؟

جواب: جس نکتہ کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا کہ جلسہ میں مخالف موقف رکھنے والے افراد بھی ہونے چاہیے یقیناً تمام جلسوں کے لئے یہ ایک مفید فکر ہے اور میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کام اچھا اور مفید ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ عصمت کیا ہے ؟ تو اس سلسلہ میں اکثر انسان یہ خیال کرتا ہے کہ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں بعض مخصوص افراد کی ہمیشہ نگرانی کیا کرتا ہے کہ جیسے ہی وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتے ہیں فوراً انھیں روک دیتا ہے ۔ مسلّم طور پر عصمت کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ اور اگر ہوں بھی تو یہ کسی کے لئے کمال کی بات نہیں ہے ۔ اگر کسی بچہ پر ایک شخص برابر نگرانی رکھے اور اسے کوئی غلط کام کرنے نہ دے تو یہ اس بچہ کے لئے کوئی کمال شمار نہ ہوگا ۔ لیکن عصمت کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو قرآن سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ صدیق کے بارے میں اس سخت منزل میں جب زلیخا ان کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی ، فرماتا ہے :

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ یعنی اس عورت نے یوسف کا ارادہ کیا ۔
وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ" (۱) اور یوسف بھی اگر دلیل پروردگار کا مشاہدہ نہ کرتے ہوتے تو اس کا ارادہ کرتے ۔

یعنی وہ بھی ایک انسان تھے ، جوان تھے اور جذبات رکھتے تھے ۔ زلیخا یوسفؑ کی طرف بڑھی لیکن یوسفؑ اس کی طرف نہیں بڑھے ۔ یوسفؑ بھی اگر شہود کی منزل پر نہ ہوتے یعنی اس عمل کی حقیقت کو اپنے سامنے ظاہر و عیاں نہ دیکھتے تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ۔ حضرت یوسف چونکہ صاحب ایمان تھے اور آپ کا ایمان کامل تھا اور ایمان شہودی کی حد کو پہنچا ہوا تھا ۔ یعنی گویا وہ اس عمل کی اچھائی اور برائی کو دیکھ رہے تھے ۔ وہ ایمان جو خدا نے یوسفؑ کو عطا کیا تھا ، وہی ایمان آپ کو اس عمل سے روک رہا تھا ۔ ہم میں کا ہر شخص کسی طاقت کے روکے ٹوکے بغیر بعض لغزشوں اور گناہوں سے معصوم ہے اور یہ ہمارے اس ایمانی کمال کا نتیجہ ہے جو ہم ان گناہوں کے خطرات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر کسی چار منزلہ عمارت کی چھت سے چھلانگ لگانا ۔ یا آگ میں کود پڑنا یہ بھی گناہ ہیں لیکن ہم ہرگز ان گناہوں کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خطرات و نقصان

---

۱ ۔ سورہ یوسف آیت ۲۴

ہمارے لئے ثابت اور ایک دم عیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ادھر ہم نے بجلی کے ننگے تار کو چھوا ادھر ہماری جان گئی۔ ہم صرف اسی وقت اس گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں جب ان خطرات سے آنکھیں بند کریں، لیکن ایک بچہ دہکتے ہوئے انگارہ پر ہاتھ مارتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس خطرہ کا گناہ جس قدر ہم پر ثابت و عیاں ہے اس پر عیاں نہیں ہے ایک عادل انسان تقویٰ کا ملکہ رکھتا ہے اسی بنا پر بہت سے گناہ وہ سرے سے انجام ہی نہیں دیتا۔ یہی ملکہ اسے اس حد تک کہ وہ ان گناہوں سے دور رہے، عصمت بخشتا ہے۔ بنابرایں گناہوں سے عصمت کا تعلق انسان کے درجۂ ایمان سے ہے کہ وہ فلاں گناہ کو گناہ اور فلاں خطرہ کو خطرہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گناہوں کو تعبداً قبول کیا ہے یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اسلام نے کہا ہے کہ شراب نہ پیو اس لئے ہم نہیں پیتے، کہا ہے کہ جوا نہ کھیلو، ہم نہیں کھیلتے۔ ہم کم و بیش جانتے بھی ہیں کہ یہ کام برے ہیں، لیکن جس قدر خود کو آگ کے حوالے کر دینے کا خطرہ یا گناہ ہم پر روشن و واضح ہے اس قدر ان گناہوں کے خطرات ہم پر واضح نہیں ہیں۔ ہم جتنا اس خطرہ سے متعلق یقین رکھتے ہیں اگر اتنا ہی ان خطرات اور گناہوں پر یقین و ایمان رکھتے تو ہم بھی ان گناہوں سے معصوم ہوتے۔ پس گناہوں سے عصمت کا مطلب ہے منتہیٰ و کمال ایمان۔ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے "لَوْ كُشِفَ الغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ يَقِيني" (۱) اگر پردے اٹھ جائیں پھر بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا" وہ قطعی طور پر گناہوں سے معصوم ہے۔ وہ پردے کے اس سمت سے بھی پس پردہ کی چیزوں کو مجسم دیکھتا ہے۔ یعنی مثال کے طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک بری بات منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حقیقتاً اپنی جان کے لئے ایک بچھو پیدا کر لیا ہے اسی بنا پر وہ ایسے کام نہیں کرتا، اور بلاشبہ قرآن بھی اس پایہ کے ایمان کا تذکرہ فرماتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عصمت نسبی ہے یعنی اس کے مراتب و درجات ہیں۔

(۱- سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۴۷ (از حضرت علی علیہ السلام)

معصومین ان چیزوں میں ـــ جو ہمارے لئے گناہ ہے اور کبھی ہم ان کے مرتکب ہوتے ہیں اور کبھی ان سے پرہیز کرتے ہیں ـــ معصوم ہیں اور ہرگز گناہ نہیں کرتے۔ لیکن تمام معصومین ایک جیسے نہیں ہیں۔ عصمت کو بھی مراحل و مراتب ہیں۔ عصمت کے بعض مراحل میں وہ ہمارے جیسے ہیں یعنی جس طرح ہم گناہوں سے معصوم نہیں ہیں، وہ حضرات بھی (عصمت کے ان مراحل و مراتب میں) معصوم نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو ہم گناہ شمار کرتے ہیں ان میں وہ صد فی صد معصوم ہیں لیکن ایسی چیزیں بھی ان کے لئے گناہ ہیں جو ہمارے لئے حسنہ اور نیکیاں ہیں، کیونکہ ہم (اس درجہ تک) نہیں پہنچے ہیں۔ مثال کے طور پر درجہ پانچ کا طالب علم چھٹے درجہ کا کوئی سوال حل کردے تو یہ اس کے لئے باعث شرف وفضیلت اور انعام کے لائق بات ہے، لیکن اگر اسی سوال کو نویں درجہ کا طالب علم حل کرے تو یہ اس کے لئے کچھ اہمیت کی بات نہ ہوگی۔ اسی طرح سمجھیں کہ کچھ چیزیں ہمارے لئے تو حسنات ہیں لیکن ان کے لئے گناہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود ان کی طرف عصیان کی نسبت دیتا ہے (وَعَصیٰ اٰدَمُ رَبَّہٗ) (۱) (آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی) یا پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ" (۲)

"تاکہ خداوند عالم آپ کے پچھلے اور اگلے گناہوں کو بخش دے۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت ایک نسبی امر ہے۔ گویا وہ اپنی حد میں اور ہم اپنی حد میں۔ پس عصمت کی اصل و ماہیت گناہ سے ایمان کے درجہ اور کمال ایمان کی طرف پلٹتی ہے۔ انسان ایمان کے کسی بھی درجہ میں ہو لیکن جس موضوع سے متعلق وہ کامل ایمان رکھتا ہے۔ یعنی:

"وَلَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ" کے درجہ پر فائز ہے اور دلیل پروردگار

۱۔ سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۱ ۲۔ سورہ فتح، آیت ۲

کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس میں وہ لامحالہ معصوم ہے۔ نہ کہ خود معصوم بھی ہماری ہی طرح ہے کہ وہ گناہ و معصیت کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے لیکن اللہ کی طرف سے مامور کوئی فرشتہ اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور اسے روک دیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھ میں اور امیر المومنینؑ میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ میں بھی گناہ کی طرف مائل ہوتا ہوں اور (معاذ اللہ) وہ بھی مائل ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان پر ایک ملک معین ہے جو انھیں اس کام سے روکتا ہے اور ہم پر اس طرح کا کوئی مامور نہیں ہے۔ اگر انسان کو گناہ سے روکنے کے لئے کوئی خارجی مامور بھی موجود ہو تو یہ کوئی کمال کی بات نہ ہوئی۔ اس کی مثال یوں ہی ہے کہ ایک شخص چوری کرتا ہے اور میں چوری نہیں کرتا، لیکن میں جو چوری نہیں کرتا اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اعمال کا نگراں ایک شخص ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس صورت میں، میں بھی اسی کی طرح چور ہوں فرق یہ ہے کہ کوئی نگراں اسے اس کام سے نہیں روکتا اور میرے حرکات و سکنات کا نگراں میری راہ میں حائل ہے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہوئی۔

مسئلۂ عصمت میں اہم اور کلی مسئلہ گناہ سے معصوم ہونے کا مسئلہ ہے۔ خطا سے معصوم ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہے اور اس کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک احکام کی تبلیغ میں خطا کا مسئلہ ہے مثلاً ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ہمارے لئے احکام بیان فرمائے ہیں لیکن شاید اس میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہے۔ شاید خداوند عالم نے ان پر وحی کسی اور شکل میں نازل فرمائی تھی لیکن آنحضرتؐ نے اشتباہاً اسے دوسری طرح سے بیان فرمایا۔ بالکل یوں ہی جیسے ہم خطا کرتے ہیں، یعنی ہم سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ یہ پیغام پہنچا دو اور ہم جا کر اس کا الٹا پیغام بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اس امکان پر کہ ممکن ہے پیغمبرؐ نے تبلیغ احکام میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہو، سرے سے پیغمبر اسلامؐ کی باتوں پر اعتماد ہی نہ ہو، قطعی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اب رہی تمام مسائل میں معصوم سے خطا کی بات تو یہاں انجینیر صاحب نے اپنی سرعت فیصلہ کا ثبوت دیتے ہوئے امیر المومنینؑ پر ظلم کیا ہے اور واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

آپ نے کیسے تیزی کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر آپ امیرالمومنین ؑ کی جگہ پر ہوتے تو عبداللہ ابن عباس کا انتخاب نہ کرتے ،اور . . . . ؟ اسی طرح کے تاریخی مسائل میں ظنی وگمانی فیصلوں کے اظہار میں تو کوئی ہرج نہیں ہے ۔ مثلاً انسان کسی شخص کے بارے میں اظہار خیال کرے کہ میں سوچتا ہوں اگر فلاں شخص پانچ سو سال پہلے اُس کام کے بجائے یہ کام کرتا تو بہتر تھا ، اور کوئی اس سے یہ کہے کہ کیا قطعی ایسا ہے ؟ تو وہ جواب دے کہ میرا ہی خیال ہے ! تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے ۔ لیکن ان مسائل میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا امیرالمؤمنین ؑ ہی کی نسبت نہیں ؟ دوسرے افراد کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے ۔

حضرت ؑ ان واقعات و مسائل میں خود حاضر و ناظر تھے اور عبداللہ ابن عباس کو ہم اور آپ سے بہتر جانتے تھے ، یوں ہی اپنے دوسرے اصحاب کو بھی ہم سے اور آپ سے زیادہ بہتر طور پر پہچانتے تھے ۔ اور ہم اپنی جگہ بیٹھ کر قضاوت کریں کہ اگر حضرت علی ؑ عبداللہ بن عباس کی جگہ پر کسی دوسرے کو منتخب فرماتے تو وہ اس کام کو بہتر طور پر انجام دیتا ۔ یہ دراصل اس طرح کے مسائل میں عجولانہ قضاوت کی نشانی ہے ۔ مزید یہ کہ آپ نے خود خود اپنے بیانات میں جن سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے رہے ہیں ، برابر یہ بات ذکر کی ہے کہ علی ؑ ایک مخصوص سیاست پر گامزن تھے اور نہ وہ خود چاہتے تھے نہ ان کے لئے سزاوار ہی تھا کہ ذرہ برابر بھی اس سیاست سے الگ ہوتے اور یہ وہ راہ سیاست تھی جس میں ان کے پاس ناصر و مددگار نہیں تھے ۔ حضرت ؑ خود بھی ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ افسوس میرے پاس افراد نہیں ہیں ۔ یہی عبداللہ بن عباس اور دوسرے افراد حضرت علی ؑ کی خدمت میں آتے تھے اور ان سے اپنی روش میں لوچ اور نرمی پیدا کرنے کی درخواست کرتے تھے یعنی وہی طرز عمل اپنانے کو کہتے تھے ، جسے آج کی دنیا میں سیاست کہتے ہیں ۔ آپ کم از کم یہی ثابت کیجیے کہ حضرت علی ؑ کے پاس ان کے ہم فکر و ہم نوا کافی افراد موجود تھے اور آپ ؑ نے ان کے درمیان اشخاص کے انتخاب میں اشتباہ سے کام لیا ۔ میں تو ثابت نہیں کرسکتا کہ حضرت کے پاس حسب ضرورت افراد موجود رہے ہوں ۔ میں بس اسی قدر جانتا ہوں کہ علی ؑ جنہیں پیغمبر ؐ نے خلافت کے لئے معین فرمایا تھا ۔ جب لوگوں نے خلافت پر

قبضہ کرلیا تو اس قدر احتجاج اور شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ لوگوں نے میرا حق مجھ سے چھین لیا۔ لیکن عثمان کے بعد جب لوگ آپ کی بیعت کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ خود کو اس امر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْراً لَهُ وُجُوهٌ وَأَلْوَانٌ ۔۔۔ وَإِنَّ الْآفَاقَ قَدْ أَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ (۱)

مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لئے) کسی دوسرے کو ڈھونڈ لو۔
بلاشبہ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رُخ اور کئی رنگ ہیں، جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں مان سکتی ہیں۔ فضائیں تاریک ہوچکی ہیں اور راستہ پہچانتے میں نہیں آتا"

مفہوم یہ ہے کہ، حالات اب خراب ہو چکے ہیں، اب کام نہیں کیا جاسکتا یعنی میرے پاس افراد نہیں ہیں، میرے رفقا تمام ہو گئے اب میرے کام کے آدمی نہیں رہے (جن کی مدد سے میں معاشرہ کی) اصلاح کرسکوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ۔۔

اب مجھ پر حجت تمام ہو گئی۔ میں تاریخ کے روبرو کوئی عذر نہیں رکھتا تاریخ میری یہ بات نہیں مانے گی۔ کہا یہی جائے گا کہ علیؑ نے موقع ہاتھ سے کھودیا، اس کے باوجود کہ یہ موقع میرے لئے کوئی موقع نہیں ہے — لیکن تاریخ کا منہ بند کرنے کے لئے کہ یہ نہ کہا جائے کہ بہترین موقع تھا جسے علیؑ نے کھودیا — اس منصب کو قبول کرتا ہوں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے خود اس کا اظہار فرمایا کہ میرے پاس آدمی نہیں ہیں اور یہ میری خلافت کا موقع نہیں ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ خطبہ ۹۱

انسان ہر شخص کے سلسلہ میں شک و تردید کا شکار ہو سکتا ہے لیکن خود حضرت علیؑ کے لئے تاریخ کو بھی اس بات میں شک نہیں ہے کہ آپ خود کو دوسروں کی بہ نسبت خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور اہل سنت بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ علیؑ خلافت کے لئے خود کو ابوبکر و عمر وغیرہ ۔۔۔۔ سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے ۔ پھر یہ کیا ہوا کہ جو علیؑ اپنے آپ کو ابوبکر و عمر سے خلافت کا زیادہ حقدار سمجھے ، جب لوگ عثمان کے بعد خلافت کے لئے اس کے پاس جائیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہوا نظر آئے اور یہ کہے کہ :-

تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے کہ میں اس کے بعد بھی تمہارا مشیر ہی بن کر رہوں ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے پاس ایسے افراد نہیں تھے ۔ اب ان کے اسباب و علل کیا تھے ۔ یہ ایک دوسری بحث ہے ۔

اب رہا : " وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ " کا مسئلہ تو اول یہ جو انہوں نے فرمایا کہ زکات انگوٹھی پر نہیں ہوتی ، اس کا جواب یہ ہے کہ کلی طور پر کار خیر کے لئے ہر طرح کے انفاق کو زکات کہتے ہیں ۔ آج کل جو فقہا کی عرف میں زکات کی اصطلاح رائج ہے اس سے مراد زکات واجب ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی " يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ " آیا ہو اس سے مراد یہی زکوٰۃ واجب ہے ۔ زکات کا مطلب ہے مال کا پاک و صاف کرنا ۔ حتیٰ کہ اس سے مراد روح اور نفس کا پاک کرنا بھی ہے ۔ قرآن کلی طور پر مالی خیرات کو مال کی زکات یا روح و نفس کی زکات کہتا ہے ۔ چنانچہ لفظ صدقہ کا مفہوم بھی اسی قدر وسعت رکھتا ہے آج صدقہ کا ایک خاص مفہوم ہے مثلاً کہتے ہیں صدقہ سری (چھپا کر صدقہ دینا) لیکن قرآن ہر کار خیر کو صدقہ کہتا ہے ۔ اگر آپ ایک اسپتال تعمیر کریں یا کوئی کتاب لکھیں جس کا فائدہ عام طور سے لوگوں کو پہنچتا ہو ۔ قرآن کی نظر میں وہ صدقہ ہے " صدقہ جاریۃ " ایک جاری صدقہ ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت نے بھی جب مذکورہ آیت سے اخذ شدہ مفہوم پر اعتراض کرنا چاہا ہے تو اس لفظ پر ایسا کوئی اعتراض

نہیں کیا ہے کہ زکات انگوٹھی سے متعلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ادبیات عرب سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظ زکات، زکات واجب سے مخصوص نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ عمل حالتِ رکوع میں کیوں اور کیسے انجام پایا؟ یہ اعتراض فخرالدین رازی جیسے قدیم مفسرین نے بھی اٹھایا ہے کہ علیؑ ہمیشہ حالت نماز میں اس قدر کھو جاتے تھے کہ انہیں ارد گرد کا احساس بھی نہ رہتا تھا۔ پھر آپؑ یہ کیسے کہتے ہیں کہ نماز کی حالت میں یہ عمل انجام پایا؟ جواب یہ ہے کہ

اول تو: علیؑ کا نماز کی حالت میں اپنے آپ سے بے خبر ہو جانا ایک حقیقت ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اولیائے خدا کے تمام حالات و کیفیات ہمیشہ ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ خود پیغمبر اکرمؐ کے لئے دونوں کیفیتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کبھی نماز کی حالت میں آپؐ پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ اذان کے تمام ہونے کی تاب بھی نہ رہتی تھی فرماتے تھے: ”اَرِحْنَا یَا بِلَالُ“ اے بلال جلد اذان ختم کرو کہ ہم نماز شروع کریں اور کبھی نماز کی حالت میں ہوتے تھے، سجدہ کے لئے سر مبارک کو خاک پر رکھتے تھے اور آپ کے نواسے امام حسنؑ یا امام حسینؑ آکر آپ کی پشت مبارک پر سوار ہو جاتے تھے اور آپؐ پورے اطمینان کے ساتھ یوں ہی ٹھہرے رہتے تھے کہ یہ بچہ کہیں گر نہ پڑے اور جب تک نواسہ اتر نہ آتا تھا سجدہ کو طول دیتے تھے۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نماز میں قیام کی حالت میں تھے۔ نماز کی جگہ پر سامنے گویا کسی نے تھوک دیا تھا۔ پیغمبرؐ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پاؤں سے اسے مٹی میں چھپا دیا اس کے بعد اپنی جگہ واپس پلٹ آئے۔ فقہاء نے اس واقعہ کی روشنی میں نماز سے متعلق بہت سے مسائل اخذ کئے ہیں۔ سید بحرالعلوم فرماتے ہیں:-

وَمَشٰی خَیْرُ الْخَلْقِ فِی الْمِحْرَابِ

یُفْتَحُ مِنْہُ اَکْثَرُ الْاَبْوَابِ

مطلب یہ ہے کہ نماز کی حالت میں پیغمبر اسلامؐ دو قدم آگے بڑھے، وہ عمل انجام

دیا اور واپس پلٹ آئے اس عمل نے ان بہت سے مسائل کو حل کر دیا کہ نماز کی حالت میں کس حد تک اضافی عمل جائز ہے یا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں کا حل مل گیا۔ چنانچہ ان حضرات کے حالات و کیفیات مختلف رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا مطلب جو عرفانی ہے یہ ہے کہ وہ افراد جو عرفانی مذاق رکھتے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ اگر استغراق و انجذاب کی کیفیت اپنے کمال پر ہو تو اس میں "برگشت" کی حالت پائی جاتی ہے یعنی اس صورت میں انسان خدا کی ذات میں مستغرق ہونے کے ساتھ ہی ماسوائے اللہ میں بھی مشغول رہتا ہے۔ یہ اہل عرفان کا خیال ہے اور میں بھی اُسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس جملہ میں شاید بہت زیادہ قابل قبول نہ ہو کہ میں اسے عرض ہی کر دوں۔ یہ خلع بدنی کے مسئلہ کی مانند ہے۔ جو افراد اس مرحلہ میں تازہ وارد ہوتے ہیں ایک لمحہ یا دو لمحہ ایک گھنٹہ تک اپنے آپ سے بے خبر یا اپنے جسم سے الگ ہو جاتے ہیں۔ بعض افراد ہر حال میں اپنے جسم سے الگ یا خود سے بے خبر رہتے ہیں۔ (البتہ میں اس کا معتقد ہی نہیں بلکہ عینی گواہ بھی ہوں) مثال کے طور اس وقت ہمارے اور آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں اپنے جسم سے دور الگ اور لاتعلق ہیں۔

اہل عرفان کی نظر میں یہ حالت و کیفیت کہ نماز کے دوران پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور انسان متوجہ نہ ہو، اس حالت و کیفیت سے ناقص تر ہے جس میں انسان نماز کے دوران فقیر و سائل کی طرف بھی متوجہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں وہ خدا سے غافل ہے اور فقیر کی طرف متوجہ ہے بلکہ اس کی توجہ خدا کی طرف اس قدر کامل ہے کہ اس حالت میں وہ تمام عالم کو اپنے سامنے موجود پاتا ہے۔ لہٰذا ان تمام قرائن کی موجودگی میں ان حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سازمان تبلیغات اسلامی

ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

شیطانی سازشیں

بنیادیں، اسباب و علل اور نتائج

موجودہ فکری دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کوئی بے معنی شغل اور سادگی کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ ایک منطقی روش کے آئینہ میں ان کی کیفیت، دوسرے واقعات و حادثات کے مجموعے میں ان کا وجود اور زمانی و مکانی عناصر سے ان کے ربط نیز دیگر حالات کی روشنی میں جب ان کا تجزیہ کیا جائے گا تو ان کے وجود میں آنے کے واقعی اسباب و علل سیاسی اُتار چڑھاؤ میں ان کا معیار اور ان واقعات کے بطن میں پوشیدہ اہداف و مقاصد نیز ان سے مقابلہ کے لئے اپنائی جانے والی صحیح و بنیادی پالیسی، ان سے منطقی طور پر نپٹنے کا طریقۂ کار اور ان کے امکانی نقصانات اور مضر اثرات سے دفاع اور بچاؤ کے نکات سامنے آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دنوں "شیطانی آیات" کے قالب میں پیش آنے والے واقعات کا اگر اسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے اور ایک تحلیلی و تجزیاتی نظم کے تحت ان کی تحقیق کی جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ واقعہ بھی ان تاریخی واقعات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جن کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو مختلف ادوار میں سیاسی، جنگی اور ثقافتی شکلوں میں سامنے آتے ہیں اور اس کا ان تمام واقعات و حادثات کے ایک جزء کے عنوان سے جائزہ لیا جانا چاہیئے:

کیونکہ اس طرح کے واقعات دراصل وہ سڑے ہوئے زخم ہیں جو انسانی حیات کی شریانوں میں پرانے بخاروں اور کثافتوں و آلودگیوں کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور یہ سراسر سادہ اندیشی ہوگی کہ یہ واقعہ کوتاہ بینی کی بنیاد پر اس نگاہ سے دیکھا جائے کہ یہ صرف ایک سادہ اور بے مقصد سیاسی شور و غل ہے یا ایک ناول نگار نے اپنی شہرت کے حصول کے لئے سستا ادبی ناول لکھا ہے، یا یہ ناشرین کے پیسہ کمانے کی ایک چال ہے۔ اسی یقین نے ہمیں آمادہ کیا کہ واقعہ کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور ماضی میں دنیائے استکبار اور عالم اسلام کے ٹکراؤ پر ایک ہلکی نگاہ ڈالتے ہوئے موجودہ زمانہ میں اس سازش کے وجود میں آنے کے اسباب و علل پر غور کیا جائے، ساتھ ہی یہ دیکھا جائے کہ مسلمانوں نے اس سازش کا کس طرح مقابلہ کیا اور اس کے آثار کیا ظاہر ہوئے تاکہ مختصر طور پر سہی واقعات کی صحیح تصویر کشی کی جا سکے۔

مغرب کی اسلام سے مقابلہ آرائی

اہل مغرب[1] عرصۂ دراز سے اپنے علاوہ دوسروں کو وحشی و بربر کہتے آئے ہیں اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے انہوں نے منحوس اور خونیں جنگوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ رومیوں کی جہاں گشائی جو انسانوں کے قتل عام اور غارت گری کا بے مثل نمونہ تھی، روم کی معین کردہ حکومت کے ذریعہ فلسطین کے علاقہ ناصرہ سے اٹھنے والی حضرت عیسیٰ کی اصل تحریک کی بیخ کنی اور اس کے بعد حضرت مسیحؑ کے آئین کو تحریف شدہ شکل میں قبول کرنا، اسلام سے قبل کی تاریخ میں ان کی حرکتوں کے چند نمونے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد اہل مغرب جو اسلام کے عالمی انقلاب کے عظیم خطرہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اس سے مزید سنجیدگی کے ساتھ مقابلہ کے لئے اٹھے جن کا تذکرہ تاریخ میں صدر اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد خلفاء کے زمانہ کی جنگوں کی شکل میں موجود ہے۔

۱۔ یہاں مغرب سے مراد اس کے جغرافیائی معنی یعنی مغربی زمینیں یا ممالک نہیں ہیں بلکہ "مغرب" وہ اصطلاح ہے جس کا اطلاق بہت پہلے سے سیاسی عرف عام میں مغربی بلاک اور مغرب کے استعماری ممالک کے لئے ہوتا آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں اس سے مراد اسلام کے مغربی دشمن ہیں۔

انصاف پسند اسلام کی بیخ کنی کے لئے اہل مغرب کا اموی حکام کے ساتھ تعاون اور حمایت یا امویوں کو روم کی طاغوتی سلطنت کی تقلید پر مائل کرنے کی ان کی کوششیں اور اسلامی حکومت کو شان و شوکت اور ترک بھڑک، عیش پرستی اور موروثی حکومت کی راہ پر لگا کر حقیقی اسلام کو مسخ کرنا اسی سلسلہ کی کڑی ہے[۱] اسی طرح جب افریقی مسلمانوں نے حیرت انگیز شجاعت و دلیری کے ساتھ مختصری مدت میں یورپ کے خاصے اہم علاقوں کو ختم کرلیا اور فرانس کی سرحدوں سے بھی گزر کر آگے بڑھ چکے تھے۔ امویوں کے فرمان سے ان پر حملے رک گئے۔ اور اس طرح مغرب کے اصلی اسلام مخالف مراکز محفوظ رہ گئے۔ چنانچہ بعد میں صلیبی مغربیوں نے مسلمانوں کی کمزوری اور ان کے درمیان اختلاف و تفرقہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیز مختلف سیاسی و ثقافتی سازشوں کو بروئے کار لاکر اسلام کو اس شہر اندلس سے باہر نکال دیا جو یورپ میں مسلمانوں کا اصل مرکز تھا۔

اس کے بعد مغربی حکام نے کلیسائی طاقت سے مل کر قرون وسطیٰ میں یورپ کے عیسائیوں کے مذہبی تعصبات کو بھڑکایا اور مسلمانوں کے علاقوں پر بارہا حملے کئے اور اپنی عدیم المثال کینہ توزی ہولناک جرائم اور بہیمانہ قتل عام کے ذریعہ مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس پر (۱۰۹۵ء میں) قبضہ کرلیا۔ اگرچہ سرانجام انھیں شکست کھانا پڑی لیکن اس تاریخ (یعنی گیارھویں صدی) سے مغرب اپنی تمام طاقت کے ساتھ پورے یورپ کو ایک پرچم کے گرد متحد کرکے اسلام کے وجود کے لئے ایک بڑا خطرہ بن گیا

بعد کی صدیوں میں بھی مغلوں کو لالچ دلا کر اور بھڑکا کر اسلامی ملکوں پر حملہ کرایا اور خود عملی طور پر

۱۔ امویوں کے دربار میں مغربی حکومتوں کے نمائندوں کے عنوان سے ایسے افراد موجود تھے جو خلافت دمشق کے رازدار اور بعض اموی خلفا کے مشیر خاص تھے اور اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بنی امیہ اسلام کے برسوں پہلے سے رومی سلطنت کی معین کردہ شامی حکومت سے تجارتی و سیاسی روابط رکھتے تھے اور اس علاقہ پر برسر اقتدار آنے کے بعد پیغمبر اسلام کے اہل خاندان اور ان کے حقیقی پیروؤں کا قلع قمع کرنے کے لئے انہوں نے ان سے اپنے روابط کو مزید محکم و مضبوط کرلیا تھا۔ رومیوں اور عیسائیوں

ان کی مدد بھی کی۔ (۱)

مغربی صلیبیوں کی اس پیہم اور طویل اسلام دشمنی میں ابتداء سے ہی متعصب اور قوم پرست یہودیوں کے ساتھ ان کا تعاون و اتحاد برقرار رہا لیکن موجودہ صدی کی گذشتہ دہائیوں میں یہ تعاون و اتحاد زیادہ مضبوطی کے ساتھ سامنے آیا یہاں تک کہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی سلطنت کو ــــ جو اپنی تمام کمزوریوں اور کمیوں کے باوجود مسلمانوں کی تنہا قانونی حکومت تھی ــــ نابود کر ڈالا۔

اسلام دشمنوں نے مسلمان اقوام کے درمیان نسل پرستی اور قومی تعصب کو رائج کیا نیز اختلافات اور ان کی کمزوریوں کو ہوا دے کر ایک مضبوط عثمانی حکومت کے بجائے اپنی طرف سے معین کردہ بہت سی کمزور اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو جنم دیا اور اسی زمانہ میں برطانیہ کی استعماری حکومت نے برصغیر ہند میں بھی مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور اس ملک سے اسلام کو مٹانے کا وہ معاندانہ رویہ اختیار کیا جو ناقابل فراموش ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد صلیبیوں اور صہیونیوں کے غیر شرعی گٹھ جوڑ کا نتیجہ اسرائیل نامی ایک منحوس وجود تھا جسے ان لوگوں نے خنجر کے مانند اسلامی ممالک کے قلب میں اتار دیا اور ساتھ ہی دوسرے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے اور انہیں غارت کرنے کے لئے آگے بڑھے اسلام کے خلاف مغرب کے معاندانہ ٹکراؤ کی داستان طویل اور پڑھنے کے قابل ہے۔ ہم یہاں اس بارے میں صرف اجمالی اشارہ کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اسلام آخری دین الٰہی کے عنوان سے، اہل مغرب کے منحوس خواہشات اور طمع کے مقابلہ میں ایک بند کی حیثیت ہمیشہ سدّ راہ رہا ہے اور ان آخری صدیوں میں بھی پرانے اور نئے استعمار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

کی مشارکت اور ان کے تعاون و ارتباط کا نتیجہ حضرت حسنؑ ابن علیؑ کی شہادت اور اموی سلطنت کے استحکام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

۱۔ مزید اطلاعات کے لئے (جوینی کی تاریخ جہاں گشا) اشپولو کی تاریخ مغول، ترجمہ محمود آفتاب بخش رابطۂ مغولان با ادیان ص ۲۳ کے بعد سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی بے پایاں دشمنی کو اور زیادہ برانگیختہ کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مختلف جہات اور گوناگوں پیرایوں میں مغرب کی جدوجہد جاری رہی ہے۔ اب ہم ان کے چند نمونے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

اسلام سے مغرب کے ٹکراؤ کی جھلکیاں

۱ ــــــ اسلام کی تاریخی اور اس کی تابندہ تہذیب کو مٹا ڈالنے کی کوشش اور اس کی جگہ مغربی ثقافت و تہذیب کو مرکزی حیثیت عطا کرنے کی جدوجہد:

مغرب اپنی تہذیب و ثقافت کے پیش نظر اسلام کی حقیقت و واقعیت کا اعتراف کرنے پر کبھی تیار نہیں تھا اور وہ اسلام کو زندہ بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اہل مغرب نے عالمی تاریخ کے نام سے جو متعدد کتابیں لکھی ہیں ان میں انہوں نے بہت بڑا احسان جو کیا ہے یہ ہے کہ اسلامی تاریخ اور اس کی تہذیب کے لئے چند سطریں یا چند صفحے مخصوص کر دیئے ہیں، جبکہ دنیائے مغرب میں ہونے والے بہت معمولی اور غیر اہم واقعات پر انہوں نے بے شمار صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں اہل مغرب کے دنیا طلب اور مادی افکار و نظریات نے نہ صرف اسلامی تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے بلکہ دوسرے عظیم پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے حالات و واقعات کو بھی افسانوں اور پارینہ داستانوں کا رنگ دے کر انھیں تاریخ کے دائرہ سے باہر نکال دیا ہے جبکہ اسی کے ساتھ آثار قدیمہ کی کھدائی اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے فراموش شدہ بادشاہوں اور اقوام و ملل کے بارے میں عجیب و غریب اور طولانی تحقیقات میں مشغول رہے ہیں۔

بعض مغربی مؤرخین مثلاً (گوستاولوبون) اور (ویل ڈورانٹ) جنھوں نے ایک حد تک انصاف پسندی سے کام لیا ہے، انہوں نے مغرب میں اسلامی تہذیب کا انعکاس بڑے وسیع پیمانہ پر محسوس کیا ہے اور بہت سے علمی و ثقافتی میدانوں میں مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی رہینِ منت اور مغرب کی تہذیب اور اس کی ارتقا کو مسلمانوں کی پُر ثمر علمی تحریک کے نتائج میں شمار کیا ہے۔ لیکن مغربی مؤرخین میں یہ استثنائی مثال کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اس قدر شجاعت کا ثبوت پیش کیا ہے، کیونکہ مغربی دنیا میں زیادہ تر اسلام کو حذف کر دینے اور حتیٰ ماضی کے درخشاں

چہروں کو بھی تاریخ سے محو کر دینے کا رجحان موجود رہا ہے۔

مثال کے طور پر اگر انہوں نے فلسفہ کی تاریخ لکھی ہے تو کوشش کی ہے کہ فلسفہ کو قدیم یونان، اس کے بعد عیسائیت کے قرونِ وسطیٰ پھر مغرب کے جدید دور اور عصر حاضر تک محدود رکھیں اور اگر کہیں اسلامی فلسفہ اور اس کے بعد عظیم مسلمان فلسفیوں کا نام بھی لیا ہے تو انہیں عرب فلسفی کہہ کر اور دوسری تحریفات کے ذریعہ انہیں قومی وملی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلام سے ان کے ارتباط کے منکر ہوئے ہیں۔

اسلام کی باشکوہ تہذیب، جس کی ارتقا کا دور کئی صدیوں تک جاری رہا اور جس نے عالم انسانیت کو اپنا رہین منت بنایا، ان کے نزدیک یورپ میں ہونے والے بعض جزئی اصلاحاتی تبدیلیوں سے کہیں بے اہمیت اور کم حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اور ان کی نگاہ میں دنیا کی تاریخ حتیٰ دنیا کا جغرافیہ بھی اصل میں مغرب اور یورپ کی تاریخ اور جغرافیہ ہے۔ ہماری اس بات کا ثبوت مغربیوں کے تحریر کردہ اکثر منابع و مآخذ ہیں جن میں سے بہت سی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ بنیادی طور پر مغرب نے تاریخی اور جغرافیائی تقسیمات میں صرف خود ہی کو تمام چیزوں کا محور و مرکز قرار دیا ہے اور اسلام کے وسیع ممالک نیز اس کی طولانی تاریخ کو بالکل ان دیکھا کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر مشرق کی قدیم ملتوں اور قوموں کو جو یونان سے بھی پہلے موجود تھیں ان دیکھا کر دیا اور یونان سے تاریخ کا آغاز کیا ہے، اور جب قرونِ وسطیٰ میں پہنچے ہیں تو اس کا یوں ذکر کیا ہے گویا ان کی طرح ساری دنیا قرون وسطیٰ کی تاریکیوں اور جہالتوں میں گم تھی۔ کیونکہ وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسی زمانہ میں اسلامی ممالک اپنی ارتقا کے اوج کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔

جغرافیائی نام رکھنے کے سلسلہ میں بھی یہ نزاکت پیش نظر رکھی ہے کہ مشرق اور اسلامی سرزمینوں کو یورپ سے نزدیکی و دوری کے اعتبار سے مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کا نام دیا گیا ہے

البتہ ان لوگوں نے گذشتہ دہائیوں میں مشرق اور اسلامی مشرق کی شناخت کی کوششیں کی ہیں، لیکن یہ کوششیں بھی زیادہ تر استعماری اغراض و مقاصد کے تحت تھیں اور درحقیقت ان علاقوں میں تہذیبی و ثقافتی مداخلت کے لئے مقدمات فراہم کرنے، زمین ہموار کرنے اور آخر کار مشرق کو اپنے منافع

ومقاصد کے لئے استعمال کرنے کی خاطر کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی ان کے محققین، مؤرخین اور مستشرقین دراصل استعمار کے لئے زمین ہموار کرنے والے ہراول دستے رہے ہیں۔

۲۔ اسلام سے علمی و ثقافتی مقابلہ اور حقائق کی تحریف

اہل مغرب ماضی میں بھی اسلام کے خلاف اکثر رذیلانہ حملے کیا کرتے تھے، تحقیق و تبلیغ کے پیرایہ میں تہمتیں اور تحریفیں عام کیا کرتے تھے۔ یہ تحریفات اور تہمتیں زیادہ تر خاندان، عورت، معاشرہ میں اس کی شخصیت، عورت کے حقوق، اسلام کے پھیلنے کا انداز اور دوسری انسانی تہذیبوں کے ساتھ اس کا رویہ جہاد، وحی، عدالت کے مسائل، اسلام میں جرم و سزا کے قوانین نیز تاریخ اسلام کے مختلف حصوں خصوصاً پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام اسلامی پیشواؤں کی زندگی اور ان کی شخصیتوں سے متعلق ہیں جو اسلامی نظریات کے ذیل میں رائج کی گئی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک موضوع پر اسلامی دانشوروں کی طرف سے تفصیلی و استدلالی کتابیں و مقالات لکھے جا چکے ہیں، اور مغرب کے بھی بعض انصاف پسند صاحبان تحقیق نے ان تہمتوں اور الزامات پر غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے عذر کا اظہار کیا ہے اور ان کا جواب دے کر ان خرافات سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ ان میں سے ایک (جان ڈیون پورٹ) کی کتاب "قرآن و پیغمبرؐ کے حضور عذر تقصیر" قابل دید ہے۔

۳۔ قومیت اور ملیت کے رجحان کی ترویج

استعمار ہمیشہ قومی عصبیت کو ہوا دے کر قوم پرستی و نژاد پرستی کی زیادہ سے زیادہ ترویج کے ذریعہ (لڑاؤ اور حکومت کرو) کی پالیسی کو عملی جامہ پہناتا رہا اور قومی اختلافات میں شدت پیدا کر کے مسلمانوں میں عرب، جنگجوئی و سرکشی اور قدامت پسندی کو ہوا دیتا رہا۔ ایران میں اس کے نمونے پور داؤد کسروی اور تقی زادہ جیسے روشن خیال نیز دوسرے اسلامی ممالک میں قومی تفکرات کے منادی اور مغربی رجحانات رکھنے والوں کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں جو مصر میں فراعنہ کے زمانہ، ایران میں کسریٰ اور ہخامنشی بادشاہوں کے دور اور عراق میں بخت النصر کے عہد کے جاہلی اقدار نیز بابل اور فنیقیوں وغیرہ کی تہذیب کو زندہ کرنے میں مصروف تھے۔ ایک حد تک وہ اپنی ان مکاریوں اور پرفریب حرکتوں میں

کامیاب بھی ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں کے ایک پیکر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔

۴۔ مسلمانوں کو اسلامی اقدار سے دور کرنا

اس سلسلہ میں مغرب نے ایک طرف سے مغربی معاشروں کی فساد انگیز تہذیب کو اسلامی ممالک میں وسیع پیمانہ پر رائج کرنے کی کوشش کی دوسری طرف سے اپنے سیاسی و ثقافتی ذرائع کا سہارا لے کر اسلامی آثار و اقدار کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ کبھی مسلمانوں کی قرآنی زبان کو بے ہودہ بہانوں کے ذریعہ، مثلاً اسے قدیم ادبیات کہہ کر اور مادری زبان کے زندہ کئے جانے کا الزام لگا کر اپنے حملوں کا نشانہ بنایا، رضاخان نیز اس کے بیٹے مردود شاہ جیسے ضمیر فروش افراد کے ذریعہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکالنے کے لئے مستقل طور پر ایک ادبی مرکز قائم کیا گیا یا اتاترک کے ذریعہ عربی زبان کے خلاف مہم چلا کر ترکی زبان کے لئے لاطینی حروف کے استعمال کو سرکاری حیثیت دے دی گئی اور کبھی پردہ کا مسئلہ اٹھا کر ملکی اور علاقائی لباسوں کو ایک ہی شکل کے مغربی لباس میں تبدیل کر دیا گیا فیشن اور ماڈل پرستی نیز مختلف شکلوں میں فحشا و فساد کو رواج دینا اور قدامت پرستی کا ٹائٹل دے کر اسلامی اخلاقیات اور اسلامی قدروں کا مزاق اڑانا وغیرہ۔۔ ان حرکتوں کے ذریعہ اسلامی امت کو اپنی مذہبی حقیقت سے دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ جن کے تباہ کن اثرات مسلمان معاشروں میں پورے طور سے مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں۔

۵۔ ملت اسلام کی چھوٹی چھوٹی کمزور سیاسی اکائیوں میں تقسیم

مغرب جس کو اندلس میں مسلمانوں کے درمیان طوائف الملوکی کی حکومت کو بڑھاوا دے کر یورپ سے اسلام کا صفایا کرنے کا کامیاب تجربہ ہو چکا تھا موجودہ صدی میں بھی وہ دوسرے بھیس اور نئے ہتھکنڈوں کے ساتھ مسلمانوں کی طاقتور اکائیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر کمربستہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قومیت کے جذبات کو ہوا دے کر اور طرح طرح کے اختلافات پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ماوراء النہر سے لے کر خلیج فارس کے سواحل اور وہاں سے چین کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے مختلف اسلامی ملک اسی سازش کا شکار تھے اور یہ بات کسی

چھپی ہوئی نہیں ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے عرب قومیت کو ہوا دے کر عثمانی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کتنی تیزی دکھائی اور ترکی نیشنلزم کی بنیاد ڈال کر اس اختلاف کو کتنا محکم بنادیا۔[1]

عرب شیوخ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے قیام، امریکہ کی مدد سے اسلامی ممالک کے قلب میں اسرائیل کی تأسیس یا برصغیر ہند میں انگریزوں کا کردار اور ایشیا کے اس حصہ میں مسلمانوں کا تجزیہ اور ان میں تفرقہ اندازی اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے حادثات نے پیکر اسلام پر کاری ضربیں لگائیں۔

لیکن ان تمام کوششوں کو اسلامی رہبروں اور اس کی بیدار و ہوشیار طاقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے بعض مقاصد میں کامیابی کے باوجود استعمار کو بہت سی ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہے۔ موجودہ صدی میں اس روش میں زیادہ ہی تیزی آئی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایک فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ گئی۔

ایران کا اسلامی انقلاب وہ بیداری کی آواز تھی جو مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دے رہی تھی اور استعماری طاقتوں کو ایک زندہ اور متحرک اسلام کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی، لہٰذا سب سے پہلے مغرب نے مختلف سازشوں اور مکروفریب کے ذریعہ اسے کامیابی سے روکنے کی کوشش کی[2] اس کے بعد اپنی تمام تر کوششیں انقلاب کو شکست دینے اور اس لہر کو پھیلنے سے روکنے پر صرف کردیں۔ آٹھ سالہ مسلط کردہ جنگ ان منحوس سازشوں میں سب سے زیادہ مضر و نقصان دہ اور شاید سب سے زیادہ اہم سازش تھی۔ لیکن اسلام کی انصاف پسند اور حق آگیں آواز جس کے شیدائی کم نہیں تھے، ایران کے جغرافیائی حدود میں دفن نہ ہو پائی اور جلد ہی دنیائے اسلام میں ایک وسیع و عریض تحریک حتی دنیا کے تمام کمزوروں اور مستضعفوں کی بیداری اور تحرک کا سبب بنی جو عالمی استعماری حکام کے تمام زور و زر اور مکروفریب کو بے اثر و بے کار کردینے والی تھی۔ اور

---

۱ ۔ ترک نیشنلزم کے موجد "دامبری" یہودی اور عرب نیشنلزم کے خالق "میشل عفلق" عیسائی کے کردار اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں۔

۲ ۔ ایران میں مختلف حکومتوں کا برسرکار آنا، شاہی مشاورتی کونسل کی تشکیل اور جنرل ہایزر کا ایران بھیجا جانا ان

اب عالم استکبار ایک بار پھر اپنے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ چراغ مصطفوی کے مقابلہ میں شرار بولہبی کے مانند متحد ہو کر میدان میں آیا ہے

مغرب کے منہ کی کھائے ہوئے استعماریوں نے اس بار بظاہر مکر و فریب کا نیا لباس پہن رکھا تھا جبکہ باطنی طور پر یہ بھی ان کی پرانی شیطانی حرکتوں کی تکرار تھی۔ فتنہ انگیز کتاب "شیطانی آیات" ایک قلم فروش و پٹھو مؤلف کے ہاتھوں دنیائے استکبار کی ہمہ جہت مادی و معنوی امداد کے ذریعہ بازار میں آئی۔

یہ سازش اس وقت سامنے آئی جب مغرب کی تہذیب و ثقافت کے خلاف پیدا ہونے والی لہر کا دائرہ بڑی وسعت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اگر گذشتہ برسوں میں مغربی پروپیگنڈہ مشینریوں کے ذریعہ اسلامی انقلاب، امام خمینی کی شخصیت اور اسلامی روحانیت کے خلاف مختلف پوچ اور بیہودہ عنوان سے (رجعت پسندی۔ ٹروریزم و تشدد پسند اور انسانی حقوق کی پامالی) جیسے اتہامات عائد کئے جاتے تھے تو اب :-

۱ـــــ زہر افشانیاں مسلمانوں کے ایمانی اصول اور اعتقادی اساس پر مرکوز کردی گئیں تاکہ مذہب کی اصل و بنیاد کی نفی کے ذریعہ مسلمان معاشروں میں تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلامی انقلاب کے اثرات اور اصل اسلام کی دوبارہ بحالی کے رجحان کو مخدوش کیا جا سکے۔

۲ـــــ دوسری طرف یہ عالمی درندے اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ صدی شدت کے ساتھ نظریاتی تبدیلیوں کی طرف مائل ہے۔ اپنے مختلف میدانوں میں مارکسیزم و کمیونزم کی شکست[1] انسانی زندگی کو منظم اور اسے ادارہ کرنے کے سلسلہ میں اس کا ناکارہ پن ثابت ہونا اور نئی نسل نیز عالمی روشن خیال اور عالمی حریت پسند تحریکوں کے لئے فکری غذا فراہم کرتے میں اس کی ناتوانی اسی طرح ان تمام مکاتب فکر سے مغربی انسان کی بیزاری و مایوسی جو ان کے اپنے مفکروں کی پیداوار

تمام سازشوں و کوششوں کے نمونے تھے۔

۱۔ مارکسزم کی شکست کے سلسلہ میں گذشتہ اور موجودہ برسوں کے دوران روس کے لیڈروں کے مکرر اعترافات نیز روس اور مشرقی یورپ میں ترمیم شدہ منصوبوں کا اجرار اس ادعا کے واضح و روشن گواہ ہیں۔

اور زیادہ تر "لبرلزم" اور آزادی کے دعووں کے ساتھ "ہیومینزم" اور "خود پسندی" کی بنیادوں پر استوار تھے۔ (۱) ان تمام مکاتب فکر نے انسان کے سامنے ایک نئے مکتب فکر کی تلاش و دریافت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ ایک ایسا مکتب فکر جو ہو سکتا ہے مغربیوں کے شیشہ کے محلوں اور ان کے شاہنشاہی منافع کو نیست و نابود کر کے رکھ دے۔ نتیجہ کے طور پر اس راہ میں ہونے والا کوئی بھی تغیر و تبدل انھیں برداشت نہیں ہے۔ اور وہ اپنے تمام وسائل و امکانات کے ساتھ اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

۳ ـــــ ایران کے اسلامی انقلاب کا وجود میں آنا اور اسلام کا ایک ایسے جامع و مانع مکتب فکر کی حیثیت سے سامنے آنا جو تمام انسانی معاشروں کی زمام امور اپنے ہاتھ میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے اس دوران پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کی اپنی اہلیت اور طاقت کو پوری طرح ثابت کیا ہے۔ مختلف اقوام و ملل کے افراد شدت کے ساتھ اس کا استقبال کر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اسلام "اس صدی کے خاتمہ تک ایک عظیم اعتقادی و فکری طاقت میں تبدیل ہونے والا ہے۔" (۲)

لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ وہ اسلام کے اس بڑھتے ہوئے خطرہ سے نپٹنے کے لئے ـــــ جو مستقبل

۱۔ اس بات کا اظہار گذشتہ دہائیوں میں یوں ہوا ہے: ہیپی ازم اور سوفسطائیت کا وجود میں آنا، مغرب میں صوفی افکار کا رواج پانا۔ "دیوار" جیسی فلموں کا بنایا جانا (جس میں ایک مغربی انسان کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں حیران و پریشان دکھایا گیا ہے یہاں تک کہ آخر میں وہ سوفسطائی و ہیپی بن جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ گذشتہ برسوں میں اس فلم پر پابندی لگانے پر مجبور ہو گئی) اسی طرح ان کے علماء و پادریوں کا صاف لفظوں میں یہ اعتراف کہ مغربی معاشرے فکری جمود کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے افکار و نظریات کا پیدا ہونا کہ عیسائیت میں کوئی نئی تبدیلی ضروری ہے۔ قابل دید حد تک اہل یورپ کا اسلام کی طرف مائل ہونا۔ ایک تیسری لہر کی مانند نئے نئے نظریات کا سامنے آنا جو اس کے لئے کوشاں ہے کہ انسانی سرنوشت کی کوئی نئی تعریف بیان کرے اور نئے سرے سے اس کا تجزیہ و تحلیل کرے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ ایک مشہور مغربی رائٹر "کیبن رائٹ" کے قول کے مطابق۔

یں ان کے ظالمانہ و مستکبرانہ منافع کے لئے خطرناک ثابت ہونے والا ہے ــــ وسیع پیمانہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے ٹکر لینے کے مقصد سے اس کی کامل شناخت کے لئے کانفرنسیں، سیمینار اور تحقیقاتی سینٹر قائم کئے جاتے ہیں اور ان کے نتائج اور طے شدہ سیاستوں کو زمان و مکان کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اور یک بیک ہم دیکھتے ہیں کہ مصر کے "نجیب محفوظ" کا ناول "اولاد حارتنا" (ہمارے پڑوس کے بچے) ۱۹۸۸ء کا نوبل ادبی ایوارڈ حاصل کرتا ہے۔ جبکہ اس میں بھی مصنف "شیطانی آیات" سے کسی قدر نرم لہجہ میں، پروردگار عالم اور تمام ابراہیمی انبیاء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔(۱) حالانکہ یہ ناول اب سے پچیس سال پہلے جمال عبدالناصر کے زمانہ میں لکھا گیا تھا اور جامعہ الازہر کی طرف سے اس کے خلاف حرمت کا فتویٰ صادر ہوا تھا۔ اور اب اسے ادبی ایوارڈ۔ بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جائے کہ "سیاسی نوبل ایوارڈ" سے نوازا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بہت سی زندہ زبانوں میں اس کے ترجمے نشر کئے جاتے ہیں۔ "محمد عبدالسلام" اسی ناول کی بنیاد پر ایک ٹیلیویژن فلم سیریز تیار کرتا ہے اور یہ طے پاتا ہے کہ یہ فلم مصر کے ٹیلیویژن سے نشر کی جائے گی۔

اسی سال یعنی ۱۹۸۸ء میں "شیطانی آیات" کے انتشار کے ہی زمانہ میں لارڈوں کی کانگریس میں ایک جدید قانون پاس ہو کر عمل درآمد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس قانون کے مطابق سرکاری اسکولوں کے تمام طلبہ کا ــــ جن میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمان طلبہ بھی شامل ہیں ــــ

۱- نجیب اپنی اس داستان میں کعبہ کو اپنے دادا (اس سے مراد جناب ابراہیمؑ ہیں) کا گھر کہتا ہے اس کے بعد تمام ابراہیمی انبیاء کے جعلی نام رکھ کر (یعنی حضرت موسیٰ کو جبل، حضرت عیسیٰ کو رافع اور حضرت محمدؐ کو قاسم) ان کی ایسی عکاسی کرتا ہے گویا یہ حضرات صرف دنیا اور زندگی کی فکر میں رہا کرتے تھے اور معاشرہ کے محروم طبقہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ پیغمبر اسلامؐ کو بیا بانی الجیلاوی کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ نجیب محفوظ کتاب "شیطانی آیات" کے نشر ہونے کے بعد سلمان رشدی کی حمایت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ "الخلیج" کی رپورٹ کے مطابق اس کی ملازمت اور گھر کے پتہ پر شیطانی آیات اور امام خمینی کے فتوے کے سلسلہ میں اس کے گستاخانہ اظہار نظر کے ردعمل میں بہت سے خطوط پہنچتے ہیں جن میں اسے موت کی دھمکی دی جاتی ہے۔

صبح کے مذہبی پروگراموں اور عیسائیت کی خصوصی دینی تعلیمی کلاسوں میں شریک ہونا ضروری قرار دے دیا جاتا ہے کہ برطانوی مسلمانوں کے سخت احتجاج اور ثابت قدمی کی بنا پر حکومت اپنا یہ قانون واپس لینے پر مجبور ہوگئی ۔ (۱)

مغربی جرمنی کے ٹیلیویژن پر قرآنی سوروں کے پس منظر میں برہنہ رقاصاؤں کے رقص کے ساتھ گانا بھی نشر کیا جاتا ہے ۔ (۲)

ایک امریکی فلم ساز کمپنی کی طرف سے سورۂ بقرہ کی ویڈیو فلم (امریکی جاسوسی محکمہ) سی آئی اے کی مدد سے مصر کے بازاروں میں عام کی جاتی ہے ، جس میں اسلام کے خلاف بہت ہی اہانت آمیز عبارتیں استعمال کی جاتی ہیں اور مصر کے مسلمانوں کے غیظ و غضب کا سبب بنتی ہے ۔ یا پھر "شالوم سلام" سیریز ، بی ۔ بی ۔ سی کے شاہی چینل کے ذریعہ تیار کی جاتی ہے ، جس میں اسلامی مقدسات کی زبردست اہانت کی جاتی ہے ۔ (۳)

۱۔ انگلینڈ کے مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا جن میں سرِ فہرست ان کے لیڈر انگلینڈ میں دسیوں اسکولوں کے اسلامی تعلیماتی منصوبوں کے ڈائریکٹر پروفیسر غلام سرور نے ، قانونی اقدامات کے ساتھ ساتھ مسلمان بچوں کے والدین کو ایک کھلا ہوا خط تحریر کر کے ان سے درخواست کی کہ اولاً ۔ اپنے بچوں کو صبح کے عیسائی مذہبی پروگراموں میں شرکت کی اجازت نہ دیں ۔ دوسرے ۔ وہ اسکول جس میں مسلمان بچوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود ہو وہاں صبح کے اسلامی پروگرام مرتب کئے جائیں ۔ تیسرے ۔ عیسائی تعلیمی کلاس کے گھنٹوں کو اسلامی اصول کی تعلیم کے لئے مخصوص کریں کیونکہ حکومت کوئی حق نہیں رکھتی کہ مسلمان بچوں کو ان کے مذہب کے خلاف مراسم میں شرکت کے لئے مجبور کرے ۔ آخر کار برطانیہ کے وزیر تعلیم کینیٹ بیکر کو اس دباؤ کے آگے جھکنا پڑا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ جن اسکولوں میں مسلمان طلبہ اقلیت میں ہیں ان کا صبح کے مراسم میں شرکت کرنا ضروری نہیں ہے اور جن اسکولوں میں ان کی اکثریت موجود ہے وہاں وہ اپنے لئے عیسائی پروگراموں کے بجائے اسلامی پروگرام رکھ سکتے ہیں ۔ (روزنامہ اطلاعات ۱۰/۱۲/۶۷ ش ھ ۳۰/۲/۸۹ء حجۃ الاسلام خسرو شاہی کا انٹرویو)

۲۔ رسالہ العالم العربی (نشر لندن) شمارہ ۳۱۱ ، مذکورہ فلم ۳۰ بہمن ۶۷ ھ ش بمطابق ۱۹ فروری ۸۹ء کو دکھائی گئی ۔

۳۔ اس فلم سیریز میں ایک مسلمان لڑکی ایک عیسائی لڑکے سے تعلقات پیدا ہونے کے بعد اسلام کو ترک کر دیتی ہے

لیکن ان تمام خرافات کے درمیان اصل کردار سلمان رشدی کے سپرد کیا جاتا ہے ۔ کہ جو مختلف مراحل میں اپنی ترقی کی راہیں طے کرتا ہوا ایک ادبی شخصیت کے عنوان سے تسلیم کرلیا گیا۔ اس کے بعد مغرب ان ثقافتی سازشوں کی طوفانی موجوں کے درمیان اپنا آخری وار کرے جو بے حیائی اور بے شرمی کی آخری ممکنہ حدوں کو بھی پھلانگ کر ایکبار سب سے زیادہ مسلمانوں کے مذہبی مقدسات کی توہین کر ڈالے ۔ یہ ایک ایسی حرکت کا آغاز ہے جو مسلمانوں میں وہ احساس کمتری پیدا کردے کہ مذہب کے تئیں ان کی حساسیت کم ہوجائے ۔جس طرح عیسائی دنیا بے شرمی کی ذلیل ترین حرکتوں کے مقابل بھی سکوت اختیار کئے رہتی ہے اور باوجود اس کے کہ ہالی وڈ کے زیرپرست فلم ڈائرکٹر پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ کو فلم "عیسیٰ کے آخری وسوسے" میں (بارتا و ماریا[1]) کی برہنہ آغوش میں دکھاتے ہیں[2] یا اخبار و رسائل وغیرہ میں عیسائی علماء کا تمسخر و مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ وہ لوگ ان استعماری سازشوں کے خلاف کوئی سنجیدہ اقدام نہیں کرتے ۔ یوں ہی مغرب چاہتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان حرکتوں سے مسلمانوں کو بھی مذہب سے بے پروا کرکے بعد کی حرکتوں کے لئے زمین ہموار کرلے ۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اچانک "شیطانی آیات" صہیونی سرمائے اور برطانیہ

اور اخلاقی گمراہیوں و گندگیوں کی طرف مائل کردی جاتی ہے ۔ اس میں ایک اداکارہ لڑکی کے ذریعہ یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے دوری اور اس کی درسی و علمی کامیابیوں کے درمیان ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے ۔ اس فلم کے رائٹر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ سیریز مغرب میں مذہب کے بڑھتے ہوئے رجحان اور رجعت پسندی سے بخوبی مقابلہ کرے گی ۔ سیریز کی اصل اداکارہ (ہیروئن) "ممتا کاشی" ہے جو نسلی اعتبار سے ہندی اور انگلینڈ کی شہری ہے اور اس سیریز میں اپنی اداکاری کی بنا پر فرانس میں ہونے والے فلم فیسٹیول میں بہترین اداکارہ کا انعام حاصل کرتی ہے ۔ ساتھ ہی بی بی سی کے چیف ڈائرکٹر نے مذکورہ سیریز کو ۸۹ء کی سب سے اہم فلم قرار دیا ہے

۱۔ مارتا و ماریا ، اس فلم میں حضرت عیسیٰ کی بیوی اور بہن کے نام ہیں !

۲۔ فلم "عیسیٰ کے آخری وسوسے" کی کہانی نیکولس کی کتاب "کازانتزاکیس" سے لی گئی ہے اور اس کا ڈائرکٹر "مارٹن سکورسزی" ہے

کی سلطنتی ادبی انجمن کی حمایت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور انگلینڈ کا سب سے بڑا ادبی انعام "بوکر پرائز" حاصل کرتی ہے اسے ایک یہودی صہیونی پبلیکیشن (پنگوئن) وائکنگ کتابی سیریز کے تحت سنہ ۱۹۸۸ء میں چھاپا ہے۔ یہ کتاب وسیع پیمانہ پر مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہے اور اعلیٰ پیمانہ پر اس ناول کی پبلسٹی کی جاتی ہے وہ بھی اس طرح کہ سلمان رشدی کو اپنے اشتہاری سفر کے لئے امریکہ کی کئی ریاستوں سے دعوت دی جاتی ہے، یا مختلف اہل قلم اور ادبی انجمنوں مثلاً برطانیہ وامریکہ کی بین الاقوامی قلم و قلمکار انجمن اور بعض دوسرے ملکوں کے ادبی حلقوں سے اس کی حمایت اور تعریف کی جاتی ہے۔

لیکن جو مسلمان گذشتہ کئی برسوں سے مختلف پیمانہ پر عالم استکبار کی جنون آمیز سازشوں کا مشاہدہ کر رہے تھے اور وقتی طور پر جزئی پراگندہ انداز میں ان کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتے آئے تھے، اس شیطانی حرکت کے مقابلہ میں انھوں نے ایسی ہوشیاری و بیداری کا انداز اپنایا کہ مغرب کو اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن موضوع کے اس حصہ پر روشنی ڈالنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے خود کتاب "شیطانی آیات" کا جائزہ لیا جائے اور سلمان رشدی کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائے، اس کے بعد اس سازش سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالیں گے۔

"شیطانی آیات" کیا ہے؟

"شیطانی آیات" ۵۴۷ صفحہ کی ایک کتاب ہے جسے پنگوئن پبلی کیشن نے اکتوبر سنہ ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے یہ کتاب شائع ہوتے ہی بلا فاصلہ مغربی پروپیگنڈہ مشینریوں کے ذریعہ "ٹائمز" کی طرح دنیا بھر میں خوب مشہور کی گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسے انگلینڈ کے سب سے بڑے ادبی انعام "بوکر پرائز" سے بھی نواز دیا گیا۔

سلمان رشدی نے اس کتاب میں اپنی گذشتہ تمام کتابوں کی طرح فطری سحر آمیز طرز اور قوت متخیلہ سے کام لیا ہے۔ درحقیقت وہ اس طرز کے انتخاب کے سلسلہ میں جنوبی امریکہ کے ناول نگاروں (بورخس اور گارسیا مارکز) کا پیرو ہے۔ بہت سے نقادوں کی رائے کے

مطابق اس کے ناول سیاسی مسائل سے پُر ہیں اور ان ہی بنیادوں پر لکھے گئے ہیں۔ جیسا کہ اس نے ناول "آدھی رات کے بچے" ہندوستان کے سیاسی حالات اور موجودہ تاریخ کے پس منظر میں لکھا تھا "شرم" پاکستانی مسائل کے پس منظر میں اور ناول "چیتے کی ہنسی" نکاراگوا کے انقلاب کی روشنی میں لکھا۔ اور اس کا یہ آخری ناول "شیطانی آیات" بھی ایران کے اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں مغربی ردعمل کا ایک نمونہ ہے۔

"شیطانی آیات"(۱) میں اس کی خیالی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ دو مرکزی کردار (صلاح الدین شمشا اور جبرئیل فاوشتا) ایک ہندوستانی ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد جہاز کا اغوا کرنے والوں کے ذریعہ یرغمال بنالئے جاتے ہیں اور آخر کار جہاز دھماکے سے منفجر ہو کر گر پڑتا ہے، لیکن صلاح الدین شمشا اور جبرئیل فاوشتا (رائٹر کے تخیل میں) دو دوسری شخصیتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ان کی روحیں تناسخ کے تحت دو برطانوی وجود میں حلول کر جاتی ہیں اور جب جبرئیل کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک نور کے ہالہ میں (جبرئیل کی شبیہ) پاتا ہے۔ لیکن صلاح الدین ایک بال دار بکری کی شکل (شیطان کی شبیہ) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ دونوں لندن میں وارد ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنے پیروؤں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے ماننے والوں میں باہم لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں

ناول نگار تخیلاتی دنیا میں جبرئیل کو مختلف تاریخی ادوار سے گزارتا ہوا پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کے

۱۔ اس کتاب کا نام ایک جعلی اور بدنام افسانہ یعنی افسانۂ غرانیق کی بنیاد پر رکھا گیا ہے جسے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے دروغ سازوں نے قرآن و پیغمبرؐ کے سلسلہ میں گڑھا ہے۔ علماء اسلام نے اس کا مفصل جواب دیا ہے۔ اس افسانہ میں پیغمبر اسلامؐ سورۂ نجم کی تلاوت کرتے وقت جس میں مشرکین کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی ہے جب انیسویں اور بیسویں آیت تک پہنچتے ہیں، جہاں ارشاد ہوتا ہے (اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی) یکایک لہجہ بدل کر مشرکین کے بتوں کی تعریف کرنے لگتے ہیں کیونکہ شیطان پیغمبر کے کلام میں حلول کر گیا تھا اور اس نے (تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی) "یہ قاز اور سارس بلند پرواز پرندے ہیں اور ان سے شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے" جیسی آیتیں وحی کے برخلاف پیغمبرؐ کی زبان پر جاری کر دیں۔

زمانے تک پہنچاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

یہ واقعہ شہر جاہلیت میں پیش آیا اور اس کے بعد وہ تاریخ اسلام کے حوالہ سے حدیثوں اور اسلام کے قدیم واقعات کو ممکن حد تک بے شرمانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ازواج پیغمبر کی بڑے ہی شرمناک انداز میں توہین کرتا ہے اور انھیں "پردہ" نامی ایک ایسے گھر میں مقید دکھاتا ہے جو فاسد اور غلط قسم کے افراد کی آمد و رفت کا مرکز ہے۔ وہ اسلامی مقدسات پیغمبر اسلام اور ان کے اصحاب کرام کی شان میں غلط، ناروا اور توہین آمیز مطالب بیان کر کے اپنے فنی ابتذال اور چھچھورے پن کی حد اور اخلاقی انحطاط کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔

اس جرم کی گہرائی سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہم یہاں اس کے بہتان اور باطل و گمراہ کن تخیلات کا ایک حصہ جنھیں اس نے ممکن حد تک بیہودہ اور شرم انگیز انداز میں بیان کیا ہے (نقل کفر کفر نباشد) کے طور پر پیش کر رہے ہیں:-

* مزدوروں اور زحمتکشوں کا ایک شہر تھا جسے "جاہلیت" کہتے تھے(۱)۔۔۔۔ اس شہر میں ایک مزدور تھا جس کا نام "ماہوند"(۲) تھا۔ جو پیغمبر ہوا اور اس نے سب سے بڑے مذہب کی بنیاد رکھی۔۔۔۔ ایسے میں اس کے کانوں میں ایک آواز گونجا کرتی تھی: تم کس قسم کا خیال ہو؟ انسان ہو یا چوہے؟ (۳)

* سب سے بڑے پادری: "ابراہیم" نے اپنی بیوی "ہاجر" اور اپنے بیٹے "اسماعیل" کے ساتھ اس بیابان میں قدم رکھا۔ اور اس وحشتناک بیابان میں اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا بیوی نے اس سے پوچھا: کیا ممکن ہے کہ (تمہارا یہ عمل) خدا کی مرضی کے مطابق ہو؟ ابراہیم نے اسے جواب دیا: ہاں یہ اللہ کی مرضی ہے۔ اس کے بعد (معاذاللہ) ولدالزنا وہاں سے چلا گیا (۴)

۱۔ اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

۲۔ ماہوند وہ نام تھا کہ عیسائی پادری قرون وسطی میں پیغمبر اکرم (ص) کو اس نام سے یاد کرتے تھے مصنف نے بھی یہی نام اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

۳۔۴۔ شیطانی آیات ص ۹۵

* وہاں "خالد" نام کا ایک تھا اور "سلمان" جیسے عجیب نام کا ایک ایرانی بلوائی و فتنہ گر بھی تھا۔ یہاں تک کہ اس بے کار و بے حقیقت مثلث کو "بلال" نامی ایک غلام نے مکمل کر دیا۔ وہ غلام جسے "ماہوند" نے آزاد کیا تھا۔ وہ بہت ہی سیاہ اور جنگلی تھا (۱)

* مومنین بغیر کسی قانون کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ان برسوں میں (ماہوند) یا بہتر ہے کوئی یہ کہے کہ فرشتوں کے سردار "جبرئیل" یا مزید بہتر ہے یہ کہے کہ "خدا" قانون معین کرنے کے وسوسہ سے دوچار ہوا؟ جبرئیل پیغمبر پر ظاہر ہوا اور ایک حکم کے بعد دوسرا حکم لاتا تھا یہاں تک کہ مومنین ہر نئے حکم وحی کو ناگواری اور (ناخوشی) کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ اسی موقع پر سلمان نے کہا: "ہر چیز کے لئے ایک حکم (آرہا ہے) ..... لعنت ہے!" کیونکہ اگر انسان ریاح خارج کرے تو اسے اپنا چہرہ فلاں طرف کر لینا چاہیئے۔ حتیٰ یہ حکم بھی معین کر دیا ہے کہ انسان طہارت کے لئے کون سا ہاتھ استعمال کرے۔ (۲)

* وحی نے مومنین سے کہا کہ: کس قدر کھائیں۔ کس قدر سوئیں اور کن حالات میں عورتوں سے جنسی تعلقات حرام کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مومنین نے سمجھا کہ لواط اور جنسی تعلقات قائم کرنا۔ فرشتوں کے سردار جبرئیل کے ذریعہ معین کیا گیا ہے۔ (۳)

* فرشتوں کے سردار جبرئیل نے میت کے دفن کا طریقہ اور اس کے اموال کی تقسیم کا قانون معین کیا ہے۔ یہاں تک کہ سلمان فارسی نے پوچھا: جبرئیل کا خدا جو اس قدر آشکار ہے کیسا ہے؟ گویا وہ خود ایک کاریگر انسان ہے۔ (۴)

* اور آخر کار جو چیز سلمان اور ماہوند کے باہمی روابط و تعلقات کے خاتمہ کا سبب بنی وہ عورتوں کا قضیہ اور شیطانی آیتیں تھیں۔ سلمان نے مستی کی حالت میں جو کچھ اس کے باطن میں گزر رہا تھا سب کچھ افشا و ظاہر کر دیا؛ سنو میں بحث و مباحثہ سے نہیں تھکتا لیکن ماہوند اپنی بیوی (خدیجہ) کی رحلت کے بعد دولت مند نہیں رہ گیا تھا۔ تم سمجھتے ہو میں

۱۔ شیطانی آیات ص ۱۵۱ ۲۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۳

۳۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۴ ۴۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۴

کیا کہہ رہا ہوں ؟ وہ میثرب (۱) میں جس سے چاہتا تھا ملتا تھا : وہ سب وہیں (مدینہ) کی عورتیں تھیں (یہاں تک کہ) ایک سال کے عرصہ میں پیغمبر کی داڑھی کے بال سیاہی سے سفیدی میں تبدیل ہو گئے ۔ (۲)

سلمان رشدی کون ہے ؟

وہ ایک ۴۱ سالہ ہندی الاصل برطانوی ناول نگار ہے ۔ جو بمبئی میں ایک مسلمان خانوادہ میں پیدا ہوا اور وہاں کے انگریزی مشن اسکول میں پروان چڑھا ۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ (بیس سال سے زیادہ) برطانیہ میں گزارا اور کیمبرج یونیورسٹی میں (۱۹۶۵ ء اور ۱۹۸۶ ء کے دوران) انگریزی ادبیات کے مراحل طے کئے ۔ اس نے اپنا پہلا ناول (آدھی رات کے بچے) (۳) عالمی استکبار کے سرمایہ سے شائع کیا ۔ جس کے ۱۵ سے زیادہ ایڈیشن چھاپے گئے اور یہ کتاب دنیا کی تیس ۳۰ زبانوں میں ترجمہ ہوئی ۔ اس کے بعد اس نے دوسرا ناول (شرم) (۴) ۱۹۸۲ ء میں شائع کیا ۔ اس کے بعد رشدی سانڈینسٹوں کے انقلاب کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر نکاراگوا بلایا گیا ۔ اس کے اس تین ہفتہ کے سفر کا نتیجہ اس کا ناول (چیتے کی ہنسی) تھا اور اس کی آخری شیطنت (شیطانی آیات) ہے جو ۱۹۸۸ ء میں شائع ہوئی ۔

اس نے اپنی تمام کتابوں کے ذریعہ اس فکر کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ استعمار کے خلاف اٹھائی جانے والی شدید تحریکیں اور انقلابات بے کار و بیہودہ لاحاصل کام ہیں ان سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا اس نے دنیا کے انقلابیوں میں یاس و ناامیدی کی تبلیغ کر کے اور ان کا مضحکہ

۱۔ اس سے مراد مدینہ ہے جسے عہد جاہلیت میں یثرب کہتے تھے ۔

۲۔ شیطانی آیات ۔ ص ۳۶۶

۳۔ اس وقت کی ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کتاب پر پابندی لگائی اور اس کے مؤلف کو مجرم قرار دیا ، نتیجہ میں بعد کے ایڈیشنوں میں ہندوستان سے متعلق اہانتیں حذف کر دی گئیں ۔

۴۔ یہ ناول بھی پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا ۔

اڑا کر ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ مغرب کا تسلط و غلبہ تسلیم کرنے کے علاوہ دنیا کے پاس کوئی اور راہ ہی نہیں ہے۔

بہر حال اس نے تاریخ کے محترم ترین اور پاکیزہ ترین انسانوں کی بے شرمانہ طور پر اہانت اور عالمی مقدسات کی ہتک حرمت کر کے قلم، آزادی بیان، تاریخ اور اس کے مسلّمہ حقائق، انسانیت اور انبیائے کرام نیز الٰہی ادیان اور اللہ کے بندوں کے ساتھ سخت خیانت کی ہے اور جذبات کو بھڑکانے نیز روئے زمین پر قتل و فساد برپا کرنے کا سبب بنا ہے جبکہ ایک فرد کے عنوان سے دراصل اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن وہ عالمی کفر کے ہاتھ میں ایک خنجر کے مانند ہے جو پاکیزہ ترین اقدار کے پہلو میں در آیا ہے اور مغرب مکارانہ انداز میں اس خنجر کو استعمال کرنے کے لئے اسے آزاد اور بے تقصیر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاریخ مغرب کے استعماری حکام کی ان رذیلانہ شیطانی چالوں کو ہرگز فراموش نہ کر سکے گی۔ ساری دنیا کے خدا پرستوں اور مسلمانوں کو مغرب کے ان انسانیت سوز اور پلید اغراض و مقاصد کو ان کی پہچان کا معیار اور ذریعہ قرار دے دینا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ یہ کتاب اسلامی و الٰہی تحریکوں کے خلاف عالمی کفر کی دشمنیوں اور مکاریوں کا ہی ایک حصہ ہے۔

از : علامہ طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ : جناب سید ولی الحسن رضوی

رسول اسلام

روایات کی روشنی میں

۳

خوشبو لگانا

کافی میں عبداللہ ابن سنان سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : رسول خدا ص کے پاس ایک مشکدان تھا جسے آپ وضو کے بعد ہمیشہ اپنے گیلے ہاتھوں سے اٹھاتے تھے چنانچہ آپ جب بھی گھر سے باہر تشریف لاتے اس کی خوشبو سے ہی پہچان لئے جاتے تھے کہ رسول اللہ صلعم ہیں ۔ (۱)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ جب بھی کوئی عطر حضرت کی خدمت میں پیش کیا جاتا آپ اس سے ضرور خوشبو فرماتے تھے اور کہتے تھے : اچھی خوشبو ہے اس کا ساتھ رکھنا آسان ہے اور اگر کبھی اس سے خود کو معطر نہ بھی کرتے تو اپنی انگلی کی نوک اس میں تر کر لیتے تھے (تاکہ دل شکنی نہ ہو) ۔ (۲)

اسی کتاب میں ہے کہ : رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تماری اگر (عود) سے دھواں لیتے تھے ۔

۱۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۵ حدیث ۳ ۲۔ مکارم الاخلاق ص ۳۴

ذخیرۃ المعاد میں ہے کہ آپ مشک کو بہترین و محبوب ترین عطر شمار کرتے تھے ۔ (۱)

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے امیر المومنین علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ : مونچھوں پر عطر لگانا انبیاء علیہم السلام کے اخلاق سے اور کرام الکاتبین کے احترام میں ہے ۔ (۲)

کافی میں ہی سکن خزاز سے منقول ہے کہ اس نے امام صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر بالغ پر لازم ہے کہ وہ ہر جمعہ کو اپنے ناخن اور مونچھیں چھوٹی کرے اور تھوڑا عطر استعمال کرے رسولؐ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) جب کبھی جمعہ کے دن عطر آپ کے پاس نہ ہوتا تو آپ مجبوراً اپنی بعض ازواج کے سر کا رومال منگواتے اور ان کو پانی میں تر کر کے اپنے چہرے پر مل لیتے تھے تاکہ اس رومال کی خوشبو سے خود کو معطر کریں ۔ (۳)

من لا یحضرہ الفقیہ میں اسحاق بن عمار سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : اگر کوئی عید کے دن رسولؐ کی خدمت میں عطر پیش کرتا تو آپ پہلے اپنی بیویوں کو مرحمت فرماتے تھے ۔ (۴)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ مختلف قسم کے روغنوں سے ضماد (مالش) فرماتے تھے ۔ نیز صاحب مکارم الاخلاق فرماتے ہیں کہ حضورؐ زیادہ تر روغن بنفشہ سے ضماد فرماتے تھے اور کہتے تھے یہ بہترین روغن ہے ۔ (۵)

سفر میں رسولؐ کی سیرت

کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں عبداللہ سنان سے اور وہ امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں

۱۔ اسی مضمون کی حدیث بحار جلد ۱۶ ص ۲۶ (حدیث ۱۵۰) اور فروع کافی ص ۵۱۷ پر کئی حدیثیں موجود ہیں ۔

۲۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۰ حدیث ۵ ۔

۳۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۱ حدیث ۱۰

۴۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۱۳

۵۔ مکارم الاخلاق ص ۳۳

کہ رسول اسلامؐ زیادہ تر پنجشنبہ کو سفر اختیار کرتے تھے۔ (۱)

کتاب امان الاخطار اور کتاب مصباح الزائر میں ہے کہ صاحب عوارف المعارف فرماتے ہیں کہ رسول خداؐ جب بھی سفر فرماتے تھے پانچ چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے : ۱) آئینہ ۲) سرمہ دان ۳) کنگھی ۴) مسواک اور ۵) ایک دوسری روایت کے مطابق قینچی بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ (۲)

کتاب مکارم الاخلاق میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب راستہ چلتے تو نشاط کی وہ کیفیت ہوتی کہ دیکھنے میں تھکن اور کسل مندی کا بالکل احساس نہ ہوتا تھا۔ (۳)

من لایحضرہ الفقیہ میں معاویہ بن عمار سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : سفر میں پیغمبرؐ اسلام جب بلندی سے نیچے کی طرف آتے تو لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے اور جب بلندی کی طرف بڑھتے تو اللہ اکبر فرماتے تھے۔ (۴)

قطب کی کتاب "لب الالباب" میں روایت ہے کہ رسول خدا صلعم کسی مقام سے اس وقت تک کوچ نہ فرماتے جب تک وہاں دو رکعت نماز نہ ادا فرما لیتے تھے آپ فرماتے تھے : کہ یہ نماز میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ یہ منزلیں جہاں میں نے نمازیں پڑھی ہیں گواہی دیں گی۔ (۵)

من لایحضرہ الفقیہ میں ہے : رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ جس وقت مومنین کو رخصت کرتے تو فرماتے تھے خداوند عالم تقوی کو تمہارا زاد و توشہ قرار دے، تمہارے لئے خیر کی راہیں باز کر دے، تمہاری تمام حاجتوں کو پورا کرے، تمہارے دین و دنیا کو سالم و محفوظ رکھے اور تم کو

۱۔ من لایحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۷۳ حدیث ۳۔

۲۔ مستدرک الوسائل جلد اول ص ۵۸، مصباح الزائر فصل اول۔

۳۔ مکارم الاخلاق ص ۲۲۔

۴۔ من لایحضرہ الفقیہ جلد دوم ص ۱۷۹ حدیث ۱

۵۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ سنن النبی در المحاسن ص ۱۷۲ اور عورف المعارف ص ۱۳۵

سلامتی اور بے پناہ منفعت کے ساتھ واپس لائے ۔ (۱)

کتاب جعفریات میں امام جعفر صادق اپنے آبائے طاہرین سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا : رسول خدا صلعم مکہ سے آنے والے افراد سے فرماتے تھے : خداوند عالم تمہاری عبادتوں کو قبول کرے گناہوں کو بخش دے ۔ اور جو کچھ تم نے اس راہ میں خرچ کیا ہے اس کے بدلے تمہیں روزی عطا کرے ۔ (۲)

آداب لباس

غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) ہر طرح کا لباس جو آپ کو فراہم ہو جاتا تھا پہن لیتے تھے چاہے وہ لنگی ہو یا عبا ، کرتہ ہو یا جبہ یا اسی کے مثل اور کوئی چیز البتہ سبز رنگ کا لباس آپ کو پسند تھا ویسے زیادہ تر سفید رنگ کا ہی لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے اپنے زندوں کو سفید کپڑے پہنایا کرو اور اپنے مرنے والوں کو بھی اسی میں کفن دیا کرو ۔ آپ زیادہ تر قبائے محشو (۳) پہنا کرتے تھے تمام جنگ ہو یا کوئی اور موقع ہو آپ کے پاس ایک دیبا کی قبا تھی جب آپ اس کو پہن لیتے تھے تو سفیدی کی زیادتی کے سبب آپ کی زیبائی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا آپ کے تمام لباس ٹخنوں سے اونچے ہوتے تھے ، تمام کپڑوں کے ساتھ زیر جامہ پہنا کرتے تھے جو پیروں کی نصف پنڈلیوں تک کا ہوتا تھا آپ ہمیشہ اپنا کرتا ایک شال سے باندھے ہوتے تھے اور کبھی کبھی نماز میں یا نماز کے علاوہ اوقات میں بھی اس کا کمر بند کھول دیا کرتے تھے ۔ اور آپ کے پاس ایک عبا تھی جو زعفران میں رنگی ہوئی تھی اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ اسی کو اپنے دوش پر ڈالتے اور لوگوں کے ساتھ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ بغیر کسی اور لباس کے صرف ایک چادر جسم پر لپیٹ لیتے تھے ۔ آپ کے پاس ایک چادر تھی جس کا اوپری استر اون کا تھا آپ اس کو پہنتے اور فرماتے تھے کہ میں بھی ایک غلام ہوں اور غلاموں کا لباس پہنتا ہوں ۔ اس کے علاوہ دو

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۸۰ حدیث ۲ ۲۔ جعفریات ص ۷۵

۳۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں ایک قسم کی قبا تھی

جامے اور بھی تھے جو جمعہ کے دن نماز جمعہ سے مخصوص تھے۔ اور ایسے کئی اتفاقات پیش آئے کہ آپ بغیر کسی جامے کے سراپا ایک چادر پہن لیتے اور اس کے دونوں کنارے اپنے دونوں شانوں کے درمیان باندھ لیتے تھے اور اکثر اوقات اسی چادر کو پہن کر نماز جنازہ پڑھاتے تھے اور لوگ آپ کی اقتدا کرتے تھے۔ کبھی کبھی گھر میں بغیر کسی لباس کے محض ایک لنگی باندھ کر نماز پڑھ لیتے تھے آپ لنگی اپنے گرد لپیٹ لیتے اور اس کا بایاں کنارہ داہنے کندھے پر اور دایاں کنارہ بائیں کندھے پر ڈال لیتے تھے ... کبھی کبھی اسی لنگی میں آپ نماز شب بھی پڑھتے تھے ... آپ کے پاس ایک سیاہ رنگ کی بھی چادر تھی چنانچہ کسی موقع پر آپ نے وہ کسی ضرورتمند کو دے دی اس وقت ام سلمہ نے سوال کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں آپ کی وہ سیاہ چادر کیا ہوئی؟ حضرتؐ نے فرمایا پہن لی گئی، ام سلمہ نے عرض کی اس کی سیاہی میں آپ کی سفیدی سے زیادہ حسین کسی کو نہیں دیکھا۔

انس کہتے ہیں: کئی بار انھوں نے دیکھا کہ حضرت نماز ظہر "شملہ" (شال نما کپڑا) پہن کر پڑھتے اور اس کے دونوں کنارے باندھ لیتے تھے، رسول خدا صلعم ہمیشہ انگھوٹھی پہنتے تھے اور اور اکثر جب آپ گھر سے نکلتے تو انگوٹھی میں ایک تاگہ باندھے ہوتے تاکہ اس کے ذریعہ جس کام کے لئے نکلے ہیں یاد آجائے، اور اسی انگوٹھی سے خطوط پر مہر لگاتے تھے اور کہا کرتے تھے، خط پر مہر کردینا تہمت سے بہتر ہے۔ رات میں زیادہ تر صرف ٹوپی یا زیر عمامہ سر پر پہن لیا کرتے تھے، اور اکثر اس کو سر سے اتار کر حاجب کے عنوان سے سامنے رکھ لیتے اور نماز ادا کرتے تھے، کبھی کبھی عمامہ سر پر نہ ہوتا صرف ایک شال سر پر لپیٹ لیتے تھے۔ رسولؐ خدا کے پاس ایک عمامہ تھا جس کو لوگ سحاب کہتے تھے، جو آپ نے علی (علیہ السلام) کو دے دیا تھا اور کبھی کبھی جب علی (علیہ السلام) اس کو پہن کر تشریف لاتے تو پیغمبر اسلامؐ ارشاد فرماتے تھے: علیؑ تو سحاب کے ساتھ آرہے ہیں حضورؐ ہمیشہ داہنی سمت سے لباس پہننا شروع کرتے تھے اور فرماتے تھے: "**الحمد للّٰہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی الناس**" تعریف اس پروردگار کی جس نے مجھ کو وہ لباس عطا کیا جس سے میں ستر پوشی کرتا ہوں اور لوگوں کے درمیان خود کو زینت عطا کرتا ہوں اور جب کبھی کپڑا اتارتے تو بائیں طرف سے اتارنا شروع کرتے تھے جب کبھی نیا لباس پہنتے تو اپنا پرانا لباس کسی فقیر

کو عنایت فرمادیتے تھے اور فرماتے تھے: کوئی مسلمان نہیں ہے جو اپنے پرانے کپڑے سے صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کسی مسلمان کا بدن ڈھانکے مگر یہ کہ وہ چیز جس سے اس نے دوسرے کی تن پوشی کی ہے اسی کے ذریعہ خود کو دنیا و آخرت میں خدا کی ضمانت اور خیر و حفاظت میں دے دے گا۔

آپ کے پاس چمڑے کی کھال کا ایک فرش تھا جس کا استر لیفِ خرما سے تیار کیا گیا تھا جو تقریباً دو ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ و ایک بالشت چوڑا تھا اور ایک عبا تھی جس کو جہاں کہیں بیٹھنا چاہتے دُہرا کرکے بچھا لیتے اور زیادہ تر بغیر کسی فرش کے چٹائی پر ہی سو رہتے تھے۔

آپ کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے جانور حتیٰ کہ اسلحے اور اثاثے کے بھی نام رکھ دیا کرتے تھے چنانچہ آپ کے پرچم کا نام عقاب تھا اور وہ شمشیر جس کے ساتھ آپ جنگوں میں شریک ہوتے تھے ذو الفقار تھی اور دوسری شمشیروں کے نام مخذم، رسوب اور قضیب تھے آپ کی شمشیر کا قبضہ چاندی سے آراستہ تھا، اور کمر کا تسمہ جو آپ اکثر اوقات باندھتے تھے چمڑے کا تھا جس میں چاندی کے تین حلقے آویزاں ہوتے تھے۔ آپ کی کمان کا نام کتوم اور ترکش کا نام کافور تھا، آپ کے ناقے کا نام عضباء، گھوڑے کا نام دلدل اور گدھے کا نام یعفور تھا اور آپ کی وہ بکری جس کا دودھ نوش فرماتے تھے عینہ تھی،

حضرتؐ کے پاس ایک مٹی کا لوٹا تھا جس سے آپ وضو کرتے اور پانی پیتے تھے اور چونکہ لوگ جانتے تھے کہ آپ کا لوٹا وضو کرنے اور پانی پینے کے لئے مخصوص ہے لہٰذا بچوں کو بھیجتے کہ وہ حفاظت و تبرک کے عنوان سے اس سے پانی پیئیں اور اس کا پانی اپنے چہرے اور بدن پر ملیں اور بچے بھی آنحضرتؐ سے بے پروا ہو کر یہ کام کرتے تھے۔ (۱)

جعفریات میں امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات میں ایک ٹوپی پہن لیتے تھے جس کے اوپر سلائیوں کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: حضرت (ص) کے پاس ایک زرہ تھی جس کو ذات الفضول کہتے تھے، اس زرہ میں چاندی کے تین حلقے تھے ایک سامنے کی طرف سے

۱۔ احیاء العلوم جلد ۷ ص ۱۳۰۔

اور دو پشت کی طرف سے الی آخر۔ (۱)

کتاب عوالی میں روایت ہے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے پاس ایک سیاہ عمامہ تھا جسے کبھی کبھی پہن کر آپ نماز پڑھا کرتے تھے (۲) نیز روایت میں ہے کہ آپ کا عمامہ اتنا لمبا تھا کہ اسے تین یا پانچ پیچ کر کے اپنے سر پر لپیٹتے تھے۔

خصال میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے حدیث اربعمائۃ کے ضمن میں فرمایا: روئی کے کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ رسول اسلام کا لباس ہے آنحضرتؐ اون اور بال کے کپڑے جب تک ضرورت نہ ہوتی نہیں پہنتے تھے۔ (۳)

من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ اسمٰعیل بن مسلم امام صادق علیہ السلام سے اور حضرت اپنے پدر بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ:

پیغمبر اسلام کے پاس ایک چھوٹا سا عصا تھا جس کے نچلے کنارے پر لوہا لگا ہوا تھا آنحضرتؐ اس عصا پر ٹیک لگاتے تھے اور نماز عید فطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ عصا آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ (۴)

کافی میں ہشام بن سالم امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: پیغمبر اسلام کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔ (۵)

اسی کافی میں ابی خدیجہ سے روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: انگوٹھی کا نگ گول ہونا چاہیے پیغمبر اسلامؐ کی انگوٹھی کا نگ بھی ایسا ہی تھا۔ (۶)

خصال میں عبد الرحیم ابن ابی البلاد سے روایت ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے پاس دو انگوٹھیاں تھیں اس میں سے ایک پر

۱۔ جعفریات ص ۱۸۴
۲۔ مستدرک جلد اول ص ۲۰۳ حدیث ۵
۳۔ خصال صدوق ص ۶۱۳
۴۔ من لا یحضرہ الفقیہ، جلد اول ص ۳۲۲ حدیث ۲
۵ کافی جلد ۶ ص ۴۶۸ حدیث ۱
۶۔ کافی جلد ۶ ص ۴۶۸ حدیث ۴

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" اور دوسری پر" صَدَقَ اللّٰہ" نقش تھا۔(۱)

اسی خصال میں حسین بن خالد امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک حدیث کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ:

رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ)، امیرالمومنینؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ نیز تمام ائمہ معصومین علیہم السلام ہمیشہ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ (۲)

مکارم الاخلاق میں امام صادق امیرالمومنین (علیہما السلام) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: انبیاء علیہم السلام کرتا، پائجامہ سے قبل پہنا کرتے تھے (۳) یہ روایت صاحب جعفریات نے بھی نقل کی ہے۔

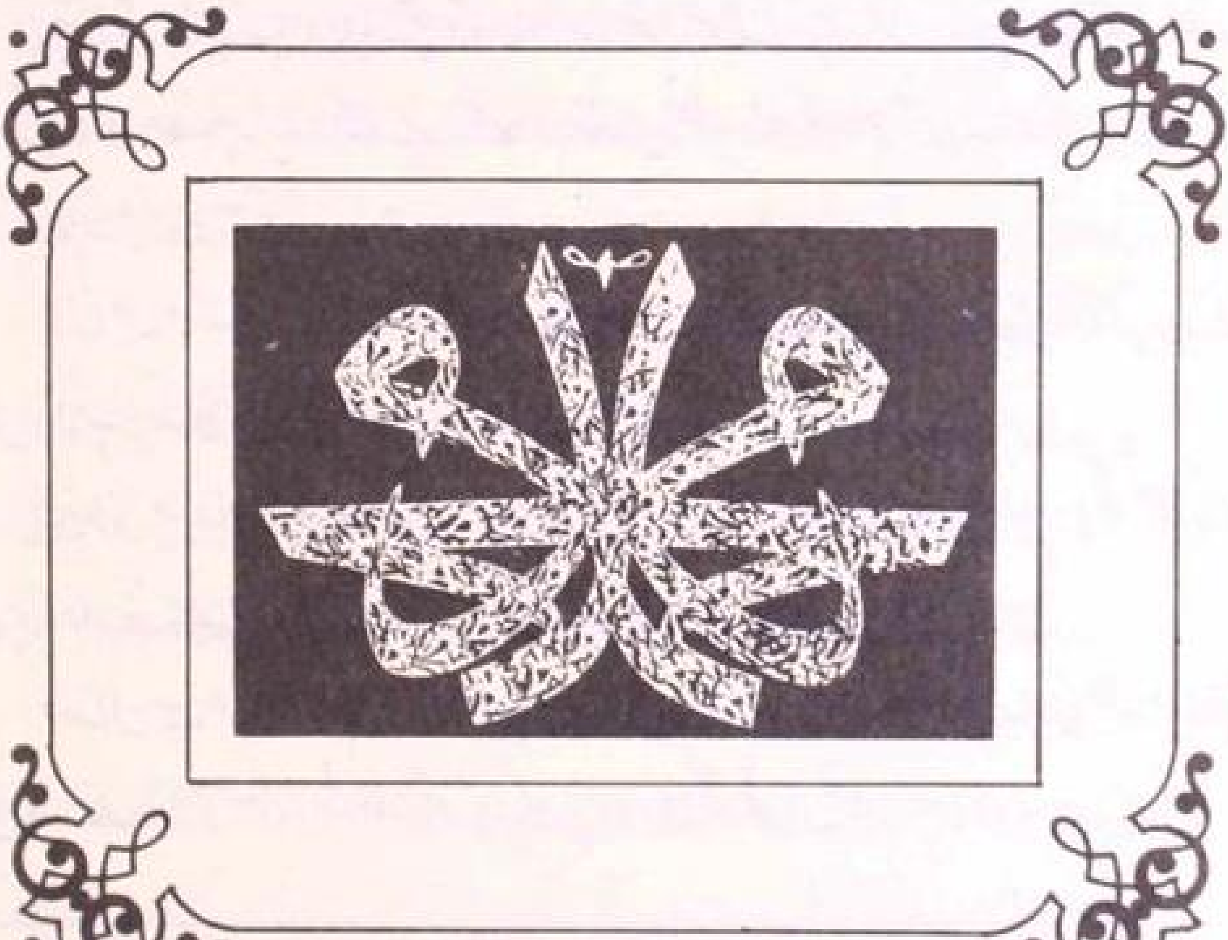

۱۔ خصال صدوق ص ۶۱

۲۔ مستدرک جلد اول ص ۲۲۹

۳۔ مکارم الاخلاق ص ۱۹

طبری

کا علمی و ثقافتی تعارف

از : جناب رسول جعفریان

ترجمہ : سید ولی الحسن رضوی

طبری کا مذہب

طبری کے مذہبی عقائد کو سمجھنے کے لئے جو بحثیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں ان ہی میں سے ایک مشہور و معروف ادیب و شاعر خوارزمی کے ساتھ اس کے ارتباط کا مسئلہ بھی ہے۔

"تاریخ الامم والرسل والملوک" اور "جامع البیان" نامی مفصل تفسیر نیز دیگر کتب کے مصنف محمد بن جریر بن یزید طبری، جیسا کہ مختلف تاریخی، تفسیری و فقہی تحریروں سے پتہ چلتا ہے، تیسری صدی ہجری اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ایران کے بزرگ علمائے اہل سنت میں سے ہوئے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۲۴ھ اور وفات ۳۱۰ھ تحریر کی گئی ہے۔ ان کی زندگی کے مفصل حالات بہت سی کتابوں میں موجود ہیں۔

ابو بکر محمد بن عباس خوارزمی چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور ادیب و شاعر ہیں جو امرا و ادبا کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے۔ خصوصاً آل بویہ کے سلسلہ میں بہت شدت پسند تھے اور ان کی بڑی مدح کرتے تھے۔ (۱) ان کی ولادت تقریباً ۳۲۳ھ میں اور وفات ۳۸۳ھ میں

(۱) ثعالبی "یتیمۃ الدہر"، تصحیح محی الدین عبد الحمید جلد ... ص ۲۰۸ نیز ملاحظہ کریں ص ۲۱۴، ۲۱۷، ۲۲۵۔

لکھی جاتی ہے۔ (۱) اشعار کے علاوہ انہوں نے رسائل اور خطوط کا مجموعہ بھی چھوڑا ہے جو ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور ۱۹۷۰ء میں شیخ الخازن کے مختصر سے مقدمہ کے ساتھ بیروت میں دار مکتبۃ الحیاۃ کی طرف سے چھپ چکا ہے۔

مذہب کے اعتبار سے وہ ایک شیعہ امامی ہیں جو فرق و مذاہب کے ماہرین اور سنی المذہب رجال کی اصطلاح میں رافضی (۲) کے نام سے جانے جاتے ہیں رفض اور تشیع کی اصطلاح میں، ان کے نزدیک، فرق یہ ہے رفض تشیع میں ہی غلو کی منزل ہے جس نے اثنا عشری کی شکل اختیار کر لی ہے جبکہ غلو سے خالی تشیع ان کے لئے ہے جو علی علیہ السلام کو عثمان پر اور احیاناً تمام خلفا پر مقدم جانتے ہیں۔ (۳) خوارزمی کا وہ خط جو انہوں نے نیشاپور کے شیعوں کے نام لکھا ہے کہ جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے حق میں حکام کے ظلم و ستم کی ایک معمولی سی تاریخی جھلک پیش کرتا ہے (۴) اس سے خوارزمی کا رفض بخوبی آشکار ہے۔

اس تمہید کے بعد یہاں طبری اور خوارزمی کے روابط پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جس سے طبری کے عقائد کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ممکن ہے اس سے طبری کا شیعیت اور شاید رفض کی طرف میلان ظاہر ہو۔ اس منزل میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ خوارزمی نامی ادیب کا مورخ طبری کا بھانجہ ہونا مشہور ہے۔

دوسری بات یہ کہ خوارزمی کے نام سے کچھ شعر ملتے ہیں جس میں اس نے "بنو جریر" یعنی اپنے ماموؤں کی طرف رفض کی نسبت دی ہے اگر یہ دونوں باتیں درست ہوں اور دوسرے شواہد سے

۱۔ سمعانی۔ "الانساب" جلد ۵ ص ۲۱۳ مطبوعہ ہندوستان۔

۲۔ دراصل اہل سنت اس کو رافضی کہتے ہیں جو خلفاء کو قبول نہیں کرتے اس مسئلہ میں بزرگوں کے درمیان کثرت سے ایسے افراد ہیں جو عثمان کے سلسلہ میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو تمام خلفاء پر اعتراض رہا ہے۔

۳۔ ذہبی کی "میزان الاعتدال" جلد اول ص ۵ ملاحظہ فرمائیں البتہ اس ذیل میں اس کے بعض دعوے درست نہیں ہیں۔

۴۔ "رسائل الخوارزمی" بیروت دار المکتبۃ الحیات، ص ۱۶۔

بھی خوارزمی کی صداقت ثابت ہو جائے تو ہم کسی بھی عنوان سے سہی، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی مورخ طبری کے یہاں تشیع کے ریشے موجود ہونا ثابت کر سکتے ہیں ۔

خوارزمی اور طبری کی رشتہ داری

بنیادی طور پر خوارزمی کے لئے مورخ طبری کا بھانجہ ہونے سے انکار مشکل ہے کیونکہ بہت سی قدیم کتابوں میں اظہار نظر کرتے ہوئے اس کو مورد تائید قرار دیا گیا ہے ۔ سمعانی، کہ جس نے علم انساب میں بہترین کتاب لکھی ہے۔(۱) اس ذیل میں لکھا ہے : خوارزم سے منسوب افراد میں سے ایک ابوبکر محمد بن العباس خوارزمی ادیب ہے، جس کو طبری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ محمد بن جریر بن یزید الطبری کا بھانجہ ہے ۔

اس کے بعد سمعانی نے صاحب "المستدرک علی الصحیحین" ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری کا وہ قول نقل کیا ہے جس میں اس نے خوارزمی کے قوت حافظہ اور تاریخ نیشاپور کی تالیف میں اس کی مدد کا ذکر کیا ہے ۔(۲)

ابن اثیر جزری نے بھی سمعانی کے ان ہی خیالات کا خلاصہ اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے ۔(۳)

ثعالبی نے اپنی اہم ادبی کتاب کے کئی صفحات خوارزمی کے رسائل و اشعار سے مخصوص کر دیئے ہیں لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس کی اصل 'طبرستان' سے تعلق رکھتی ہے اور اس کو 'طبر خزی' بھی کہا گیا ہے، اس کا طبری سے ارتباط ذکر نہیں کیا ہے ۔ (۴)

۱۔ البتہ اس کی کتاب انساب کے رائج معنوں میں نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف نسبتوں کے سلسلہ میں تحقیق کی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں شہروں اور قبیلوں وغیرہ سے منسوب ناموں وغیرہ سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے مثلاً یہی خوارزمی کا عنوان ۔

۲۔ سمعانی "الانساب"، جلد ۵ ص ۲۱۳ و ۲۱۴ ۔

۳۔ ابن اثیر الجزری ۔ "اللباب فی تہذیب الانساب" مطبوعہ دار صادر بیروت ۔ جلد اول ص ۴۶۸ ۔

۴۔ ثعالبی ۔ یتیمۃ الدہر، جلد ۴ ص ۲۰۴ ۔

ابن خلکان، جس کو شرح حال لکھنے کے سلسلہ میں شہرت حاصل ہے، اس کو طبری کا بھانجہ قرار دیا ہے۔ (۱)

ذہبی نے بھی، جس کا اہل سنت کے مشہورترین رجال میں شمار ہوتا ہے، بعینہ اسی بات کی تائید کی ہے۔ (۲)

ان حضرات کی عبارتوں سے بخوبی واضح ہے کہ انھوں نے طبری سے اسی مشہور مورخ طبری کو مراد لیا ہے کہ جس کے دادا کا نام یزید ہے کوئی اور طبری ان کی مراد نہیں ہے۔

جن لوگوں نے خوارزمی کو مورخ طبری کا بھانجہ تحریر کیا ہے ان میں "ابن فندق" کا نام لیا جا سکتا ہے جو خود بھی طبری سے نسبت کا معتقد ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں مؤرخین کے ناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "۔۔۔۔۔ اس کے بعد محمد بن جریر طبری نے جو ابوبکر خوارزمی ادیب کا ماموں تھا، ایک عظیم تاریخ تصنیف کی، خاندانی نسب کے اعتبار سے میرا بھی ایک سلسلہ محمد بن جریر طبری مورخ تک پہنچتا ہے۔ جیسا کہ حاکم ابو عبداللہ حافظ نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے۔ (۳) وہ اپنی کتاب تاریخ بیہق میں ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"۔۔۔۔ اور خواجہ ابوالقاسم الحسین ابن ابی الحسن بیہقی ایک شجاع و صاحب شہامت شخص تھا شاہان وقت اس کو عزیز و محترم رکھتے تھے، اور اس کی والدہ ابوالفضل ابن استاذ العالم ابوبکر خوارزمی کی صاحبزادی تھیں، اور استاد عالم فاضل ابوبکر خوارزمی، محمد بن جریر طبری مؤرخ کے بھانجے تھے، کہ جن کی تاریخ و تفسیر مشہور ہے اور حاکم ابو عبداللہ حافظ نے اپنی تاریخ نیشاپور میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ (۴)

ابن العماد حنبلی (۵) اور یافعی (۶) بھی ان متقدمین میں ہیں جنھوں نے اس کو طبری کا بھانجہ کہا ہے۔

۱۔ منقول از خوانساری۔ روضات الجنات جلد ۷ ص ۲۹۶ مطبوعہ اسماعیلیان قم۔

۲۔ ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۱۶ ص ۵۲۶ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ۔ بیروت۔

۳۔ ابن فندق۔ تاریخ بیہق تصحیح ڈاکٹر بہمنیار مطبوعہ فردغی، تہران ص ۱۶ ۴۔ ایضاً ص ۱۰۸

۵۔ الحنبلی۔ شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، جلد ۳ ص ۱۰۵ ۶۔ یافعی۔ مرآت الزمان جلد ۲ ص ۲۱۶

اور یہی بات زرکلی نے بھی " الاعلام " میں لکھی ہے ۔ (۱)

متقدمین میں کوئی بھی ایسا نہیں ملتا جس نے اس کے طبری کا بھانجہ ہونے کی تکذیب کی ہو یا کسی دوسرے طبری کو ، جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے ، خوارزمی کا ماموں بتایا ہو ۔

خوارزمی کا کلام

(د) اب جب کہ طے ہو گیا کہ تاریخی اعتبار سے خوارزمی کے طبری کا بھانجہ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے اگرچہ بعض متأخرین نے اس سلسلہ میں بلاوجہ شک و شبہہ پیدا کیا ہے ، ہم خوارزمی کا وہ کلام پیش کرتے ہیں جو اس نے اس ذیل میں کہا ہے ۔ اس نے اس شعر میں " بنوجریر " سے اپنے ارتباط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو " رافضی " کے لفظ سے یاد کیا ہے ۔ پہلے ہم یاقوت حموی کے حوالے سے شعر پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے بارے میں اس کی رائے پیش کریں گے ۔

بآمل مولدی وبنو جریر   فاخوالی ویحکی المرء خاله

فہا انا رافضی عن تراث   وغیری رافضی عن کلالہ (۲)

یعنی میں آمل میں پیدا ہوا ، اور بنوجریر میرے ننھیالی (یا ماموں زاد) ہیں اور ہر شخص اپنے ماموں کی روش اپناتا ہے ۔ یاد رکھو میں " وراثۃً " یعنی باپ دادا سے رافضی ہوں جبکہ دوسرے (ماں باپ کے بجائے) کلالہ کی بنیاد پر رافضی بنے ہیں ۔

یہی شعر کتاب ' نقض ' میں ، جسے عبد الجلیل رازی قزوینی (متوفی ۵۶۰ ہجری) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ، اس کے مصنف نے نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں : " اور ابو بکر خوارزمی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شیعہ عقیدہ رکھتا تھا اور اس فضل و شرف کا فضلاء انکار نہیں کرتے ۔ یہ اشعار اسی کے ہیں " ۔

اگرچہ صاحب ' نقض ' کا خیال ہے کہ ہرگز کسی شیعہ کا ابو بکر نام نہیں ہوا ہے ۔ اور اس کے بعد

---

۱ ۔ زرکلی ، " الاعلام " جلد ۶ ص ۱۸۳   ۲ ۔ یاقوت حموی ۔ معجم البلدان جلد اول ص ۵۷

شعر نقل کیا ہے البتہ انھوں نے خوارزمی کا دوسرا شعر یاقوت کے پیش کردہ شعر سے مختلف تحریر کیا ہے

فمن یك رافضیاً عن تراث　　　　فانی رافضی عن کلالہ (۱)

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب پہلے کے شعر سے بالکل برعکس ہے کہ رفض اس کو وراثت میں نہیں بلکہ کلالہ سے ملا ہے اور شاید یہی مضمون پہلے کی نسبت زیادہ درست بھی ہے۔

ابن ابی الحدید نے بھی یہ اشعار نقل کئے ہیں (۲) اور غلطی سے مؤرخ طبری کے بجائے طبری امامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے طبری کو ہی ان کا خالق جانا ہے اور ظاہری بات ہے اس طرح کی رائے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ یاقوت، جو خود بھی ایک مشہور ادیب ہے، یا صاحب "نقض" کسی ایک نے بھی اس کو طبری، چاہے وہ مؤرخ ہو یا امامی، کسی کی طرف بھی منسوب نہیں کیا ہے بلکہ اس کا خالق خوارزمی کو ہی قرار دیا ہے۔

ابن فندق نے بھی، کہ جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ان اشعار کی خوارزمی کی طرف نسبت دی ہے البتہ صرف پہلا شعر نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔ (۳)

صاحب نقض نے خوارزمی کی کنیت ابوبکر ہونے کی بنیاد پر جو اس کے شیعہ ہونے میں شبہہ ظاہر کیا ہے اس کے سلسلہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

اولاً - جیسا کہ یاقوت نے کہا ہے اور نیشاپور کے شیعوں کے نام اس کے خط سے بھی پتہ چلتا ہے کہ خوارزمی بلا شبہ شیعہ امامی یا مروجہ اصطلاح کے مطابق رافضی ہے۔

دوم - یہ کہ ممکن ہے، جیسا کہ یاقوت اور ابن ابی الحدید کے نقل کردہ اشعار سے پتہ چلتا ہے (ابن ابی الحدید نے "فمن یك رافضیاً عن ابیہ" لکھا ہے) اس کا باپ سنی رہا ہو اور اسی نے اس کی کنیت ابوبکر رکھی ہو اور اس نے اپنے ماموؤں سے متاثر ہو کر "رفض" قبول کیا ہو جیسا کہ اس نے کہا ہے "یحکی المرء خالہ"۔

سوم - یہ کہ صاحب "نقض" نے دیکھا ہو گا کہ شیعہ رجال کی کتب میں ائمہ علیہم السلام کے

۱- عبدالجلیل رازی قزوینی - "نقض" ص ۲۱۸　　۲- ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد ۲ ص ۳۶

۳- ابن فندق، تاریخ بیہق ص ۱۰۸

بہت سے اصحاب کے نام عمر ملتے ہیں حتیٰ بعض کی کنیت ابوعثمان بھی ملتی ہے (۱) (پس کیسے یہ کہا جا سکتا ہے ایک شیعہ کی کنیت ابوبکر نہیں ہو سکتی ؟)

چہارم ۔ یہ کہ ممکن ہے صاحب "نقض" نے اپنے زمانہ پر نظر رکھی ہو یا طنز کے عنوان سے یہ بات کہی ہو ۔

بہرحال صاحب نقض کا ایراد و انکار اس منزل میں قابل قبول نہیں ہے ۔

خوارزمی کے کلام پر یاقوت کی رائے

یاقوت حموی' معجم البلدان' میں شہر آمل کے ذیل میں خوارزمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "یزعم ان اباجعفر خاله" یعنی وہ گمان کرتا ہے کہ ابوجعفر طبری اس کا ماموں ہے اس کے بعد اس کا یہ شعر نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے : وکذب ولم یکن ابوجعفر رحمه الله رافضیاً " یعنی وہ جھوٹ بولتا ہے ابوجعفر رافضی نہیں تھا ۔ (۲)

اب رہا یہ کہ یاقوت نے جملہ کی ابتدا ' یزعم ' سے کی ہے اور بعد میں اس کی طرف کذب کی نسبت بھی دی ہے تو آیا وہ طبری کا بھانجہ ہونے کے سلسلہ میں خوارزمی کی تکذیب کرنا چاہتا ہے ؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ طبری کی جانب خوارزمی نے رفض کی جو نسبت دی ہے وہ اس کی تکذیب کرنا چاہتا ہے جیسا کہ اس نے طبری کے بارے میں عدم رفض کا اعلان بھی کیا ہے ۔

خوارزمی کی رائے کے جواب میں صاحب ' روضات الجنات ' نے وحید بہبہانی کے صاحبزادے کی کتاب ' مقامع الفضل ' کی بحث نقل کی ہے چنانچہ صاحب مقامع نے اپنی کتاب میں اس بات کے جواب میں کہ محمد بن جریر طبری کہ جن کا ہماری رجال کی کتابوں میں ذکر ملتا ہے کون شخص ہے ؟ لکھا ہے کہ : دو افراد محمد بن جریر کے نام سے ملتے ہیں، ایک ' ابن جریر بن غالب طبری ' ہیں جو شافعی مذہب تھے (۱) اور نووی شافعی نے کتاب تہذیب الاسماء' میں ان کی مدح کی ہے ، یہ وہی تاریخ و تفسیر

۱۔ نجاشی ۔ ص ۲۰۲ ، ۲۱۷ مطبوعہ ' داوری ' قم ۲۔ یاقوت ۔ معجم البلدان جلد اوّل ص ۵۷ ۔

۳۔ طبری کے شافعی ہونے کی رائے درست نہیں ہے کیونکہ طبری ایک مستقل فقہی مذہب کا حامل ہے جیسا کہ ابن ندیم نے اپنی کتاب " الفہرست " میں ذکر کیا ہے ۔

کے مصنف ہیں جن کی دونوں کتابیں مشہور ہیں ۔ دوسرے محمد بن جریر بن رستم طبری ہیں جنھوں نے "المسترشد" اور "الایضاح" نامی کتابیں لکھی ہیں اور جن کے تشیع میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے یہی وہ طبری ہیں کہ جن کے بھانجے خوارزمی نے ان کی تعریف میں کہا ہے "بآمل مولدی ۔۔۔" لیکن یاقوت کو اس مسئلہ میں شبہ ہوا ہے لہٰذا اس نے خوارزمی کی تکذیب کردی ہے ۔

صاحب مقابس کی اس توضیح کی بنیاد پر صاحب روضات نے لکھا ہے کہ : یاقوت کے اشتباہ کی وجہ اس کا یہ گمان بنا ہے کہ خوارزمی نے خود کو طبری مؤرخ کا بھانجہ قرار دیا ہے اور اس کے بعد اس پر استدلال کرتے ہوئے کہ خوارزمی کی مراد طبری مؤرخ نہیں ہے اضافہ فرماتے ہیں : اگر شیعہ رجال کی کی کتب کا دقت نظر کے ساتھ جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ طبری مؤرخ کا طبقہ خوارزمی سے تقریباً سو سال قبل کا ہے اگرچہ ابن خلکان نے اس کو مؤرخ طبری کے بھانجے کے عنوان سے ہی ذکر کیا ہے ۔ (۱)

صاحب اعیان الشیعہ نے بھی اسی نظریے کو قبول کرتے ہوئے کہا ہے کہ خوارزمی مؤرخ طبری کے نہیں بلکہ طبری امامی کا بھانجے ہیں ۔ (۲)

اس منزل میں اصولی طور پر ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ تاریخ میں دو طبری کیا بلکہ تین طبری ملتے ہیں جنکی کینت ، نام ، باپ کا نام طبری سے نسبت حتیٰ لفظ آملی (۳) بھی مشترک طور پر سب کے یہاں موجود ہے ۔ رجال نجاشی ہیں ان دونوں میں سے ایک کا مذہب عامہ کی فہرست میں نام لیا گیا ہے (۴) اور دوسری جگہ دوسرے طبری کا 'امامی' کے عنوان سے ذکر ہوا ہے ۔ (۵) اسی طرح شیخ طوسی نے بھی اپنی فہرست میں عامہ سے متعلق محمد بن جریر (۶) سے الگ امامی مذہب محمد بن جریر کا ذکر کیا ہے اور صریحی طور پر کہا ہے کہ یہ صاحب تاریخ و تفسیر طبری سے الگ ہے ۔ (۷) مرحوم

۱۔ خوانساری "روضات الجنات" جلد ۷ ص ۲۹۳ ، ۲۹۴

۲۔ العاملی ۔ "اعیان الشیعہ" جلد ۹ ص ۳۷۷ ، ۳۷۸ و ۱۹۹

۳۔ ابن ندیم "الفہرست" ص ۲۹۱ (اس نے مورخ طبری کو طبری آملی بھی لکھا ہے)

۴۔ نجاشی ص ۲۲۵ ۔۔۔ ۵۔ نجاشی ص ۲۲۶

۶۔ الطوسی "الفہرست" تحقیق آل بحر العلوم ص ۱۵۰ ۔۔۔ ۷۔ ایضاً ص ۱۵۹

آقا بزرگ طہرانی اور خوانساری نے بھی اس ذیل میں وضاحت کی ہے خصوصاً مرحوم خوانساری نے زور دیا ہے کہ ایک اور طبری تاریخ میں موجود ہے جو نجاشی کا ہم عصر تھا اور نجاشی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے (۱)

یاقوت کے دعوے کا مسئلہ ذرا اس سے الگ ہے جس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے لیکن ہمارے سامنے جو مشکل ہے وہ یہ کہ طبری اپنی تحریروں کے مطابق عامہ کا مذہب رکھتا ہے لہٰذا ہم مسلم تاریخی شواہد کے برخلاف خوارزمی کو مؤرخ طبری کا بھانجہ سمجھنے کے بجائے طبری امامی کا بھانجہ سمجھیں، یہ بات صحیح تاریخی تحقیق کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ جب سمعانی، یاقوت، ابن فندق، ذہبی ابن العماد حنبلی ابن خلکان اور یافعی اس کو مؤرخ طبری کا بھانجہ مانتے ہیں تو یہ کون سی بات ہوئی کہ ہم نص کے مقابل اجتہاد سے کام لے کر اس کو طبری امامی کا بھانجہ تسلیم کریں۔ مذہب کا مسئلہ بھی ایک مشکل ہے اور یہی چیز تنازعہ کا سبب ہے اب ایسے میں مورد اختلاف چیز کی قیمت معین نہیں کی جا سکتی۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ہم بعد میں، طبری کے رافضی یا شیعہ ہونے کے سلسلے میں گفتگو کریں گے لیکن یہاں تک کی گفتگو اور تذکرہ نویسوں کی تحریروں کی روشنی میں اتنا تو تسلیم کرنا ہی چاہیے کہ خوارزمی مؤرخ طبری کا بھانجہ ہے۔ اب جو اعتراض رہ جاتا ہے، وہ خوانساری کا اٹھایا ہوا نکتہ ہے کہ تاریخ میں طبری کا طبقہ خوارزمی سے تقریباً سو سال قبل کا ہے۔ (لہٰذا خوارزمی کو طبری کا بھانجہ کیسے تسلیم کیا جائے؟)

فرض کرتے ہیں کہ خوارزمی طبری امامی کا بھانجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کس محمد بن جریر طبری امامی کا؟ مرحوم آقا بزرگ کی تحقیق کے مطابق (۲) ایک ـــــ محمد بن جریر بن رستم بن جریر یا یزید طبری ہے جس نے "کتاب المسترشد" لکھی ہے اور کلینی (متوفی ۳۲۹ ہجری) کا ہم عصر ہے اور دوسرا محمد بن جریر بن رستم طبری، صاحب "دلائل الامامۃ" ہے جو شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ ہجری)

۱۔ خوانساری "روضات الجنات" جلد ۷، ص ۲۹۴، شیخ عباس قمی "الکنی والالقاب" جلد اول ص ۲۳۱ - ۲۳۲

۲۔ آقا بزرگ طہرانی "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" جلد ۲۱ ص ۹ - جلد ۸ ص ۲۴۱ اور اس کے بعد مطبوعہ دار الاضواء بیروت

اور نجاشی (متوفی ۴۵۰ ہجری) کا معاصر ہے۔ ظاہر ہے اگر پہلا طبری مراد لیں تو وہی اعتراض اس کے بارے میں بھی پیدا ہوگا (کہ اس کا شمار سو سال قبل کے طبقے سے ہے۔) اور اگر دوسرے کو مانتے ہیں تو اس کی رحلت خوارزمی سے تقریباً ستر سال بعد کی ہے۔ جبکہ مؤرخ طبری کی وفات خوارزمی سے تہتر سال قبل واقع ہے اس صورت میں بھی یہ اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔

اسی طرح چونکہ یہ اعتراض بہر حال باقی رہتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ وہی مشہور قول کہ خوارزمی مؤرخ طبری کا بھانجہ ہے قبول کر لیا جائے۔ اور جو چیز اس نکتہ کی مؤید ہے یہ ہے کہ خوارزمی جیسے شخص کے لئے جو پورے اسلامی معاشرہ کے ثقافتی افق پر ظہور کرتا ہے، وہ معاشرہ جس کی اکثریت اہل سنت حضرات پر مشتمل ہے اس کے لئے افتخار اس میں ہے کہ وہ مؤرخ طبری سے نسبت پر ناز کرے، ظاہر ہے سب کے سب طبری امامی کو نہیں جانتے تھے۔ خصوصاً جبکہ آقا بزرگ کی تحقیق کے مطابق کلینی کے ہم عصر محمد بن جریر طبری امامی، طبری صغیر کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، اور دوسرے امامی طبری بھی شاید خوارزمی کی تاریخ وفات کے آس پاس ہی پیدا ہوئے تھے کیونکہ وہ پانچویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں اور خوارزمی نے ۳۸۳ھ میں وفات پائی ہے۔

اب رہا اصل اعتراض کہ اگر مشہور مؤرخ طبری، خوارزمی کے ماموں تھے تو دونوں کی عمروں میں تہتر سال کے فاصلے کا کیا کیا جائے؟ تو اس کے حل کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حرج ہی کیا ہے اگر ایک شخص کے ماموں کی وفات اور خود اس کی وفات کے مابین تہتر سال کا فرق پایا جاتا ہو اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ خوارزمی کو طبری کی بہن کا نواسا مان لیں اس طرح طبری کی بہن کی اولاد ہونے میں بھی کوئی شک نہ ہوگا اور عمروں میں فرق کا مسئلہ بھی پیش نہ آئے گا۔

کیا طبری رافضی تھے؟

اب اصل سوال یہ ہے کہ آیا طبری کو رافضی کہنا درست بھی ہے یا نہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس طرح کی نسبت کے امکان کو۔ ایک خاص عنوان سے ہی، ظاہر کرتے ہیں۔

سب سے پہلی دلیل تو یہی ہے کہ طبری حنبلیوں کے عتاب و غضب کا نشانہ رہے ہیں اور اس بات سے قطع نظر جو "اختلاف الفقہاء" کی تالیف کے سلسلے میں کہی جاتی ہے کہ یہ کتاب طبری نے لکھی ہے اور چونکہ وہ احمد بن حنبل کو فقیہ نہیں بلکہ صرف ایک محدث کے طور پر تسلیم کرتے تھے اس لئے انھوں نے احمد بن حنبل کا نام اس کتاب میں نہیں لیا ہے۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ ان کا شیعی طرز فکر بھی بنا ہو کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب بغداد میں اصل معرکہ آرائی حنبلیوں اور شیعوں کے درمیان ہی تھی اور یہ ایک مسلمہ امر ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خود یاقوت نے "معجم الادباء" میں لکھا ہے :-

"ودفن ليلاً خوفاً من العامة لانه كان يتهم بالتشيع" (۱)

یعنی ان کو عامہ کے خوف سے رات میں ہی سپرد خاک کر دیا گیا کیونکہ ان پر تشیع کا الزام تھا۔

یاقوت نے "معجم البلدان" میں طبری کا رافضی ہونا قبول نہیں کیا ہے اس نے خوارزمی کے شعر کی تکذیب کرتے ہوئے لکھا ہے: "حنبلیوں نے طبری کے سلسلہ میں حسد سے کام لیتے ہوئے ان پر رافضی ہونے کا الزام عائد کر دیا ہے اور خوارزمی نے بھی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو رافضی کہہ دیا ہے"۔ (۲)

یہ کہ طبری رافضی ہوں، ان کی تاریخ و تفسیر کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن اس کو سرے سے بے بنیاد بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خوارزمی کے اظہارات نیز ان کے بارے میں جو دوسری باتیں شہرت رکھتی ہیں ان کے پیش نظر اس کی توجیہ دو طرح سے فرض کی جا سکتی ہے۔

اول یہ کہ : طبری اپنی آخر عمر میں شیعیت کی طرف مائل ہو گئے تھے، حتی اپنے رفض کی نشان دہی بھی کر دی۔ اگرچہ حنبلیوں کے خوف کی وجہ سے صریحی طور پر اس کے اظہار کی جرأت نہیں کر پائے۔

دوم یہ کہ : وہ بنیادی طور پر، اموی طرز فکر کے برخلاف، ایک منصف مزاج سنی کی حیثیت سے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل سے متعلق روایات کو قبول کرتے تھے اور دوسرے مسائل میں بھی انہوں

۱۔ یاقوت۔ معجم الادباء، جلد ۱۷، ص ۸۰ ۲ ایضاً جلد اول ص ۵۷

نے اعتدال کی راہ اپنائی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ پہلا احتمال صحیح ہو (۱) اور یہ ان کے سلسلے میں رفض کی تعبیر کے ساتھ بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ طبری کی عمر کا ایک بڑا حصہ مکتب اہل بیتؑ سے انحراف میں گزرا ہے لیکن آخر عمر میں تشیع اور رفض کی طرف رجحان پیدا ہو گیا تھا لہٰذا عامہ کے خوف سے ان کو لوگوں نے راتوں رات سپرد خاک کر دیا تھا۔

خوارزمی بھی چونکہ "طبری کے اہل بیت" سے ہے لہٰذا "اور بی بمانی البیت" کے تحت گھر کی بات بہتر جانتا ہے۔ دیگر افراد میں سے جنھوں نے طبری کی طرف رفض کی نسبت دی ہے ایک "احمد بن علی سلیمانی" ہیں جو کہتے ہیں:۔

"کان یضع للروافض" یعنی وہ رافضیوں کے لئے حدیث گڑھا کرتا تھا۔

ذہبی نے سلیمانی کے اس قول کی تکذیب کرتے ہوئے کہ اس طرح کا الزام طبری جیسے شخص پر صادق نہیں آتا لکھا ہے:۔

"فیہ تشیع (یسیر) وموالاۃ لا تضر" یعنی اس کے اندر تھوڑا بہت شیعیت اور اہل بیت دوستی کا عنصر ہے مگر نقصان دہ نہیں ہے۔ (۲)

اس کے بعد ذہبی نے لکھا ہے: "شاید سلیمانی نے ابن جریر بن رستم طبری کو مراد لیا ہے"، لیکن ہماری نظر میں یہ احتمال صحیح نہیں ہے بعید نظر آتا ہے کہ سلیمانی جیسا عالم اہل سنت یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کس طبری کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ بخصوصاً جبکہ ان کے نزدیک مورخ طبری کی شہرت عام ہے۔

آخری عمر میں شیعیت کی طرف میلان کا ایک اور ثبوت طبری کی لکھی ہوئی وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے حدیث غدیر کے طُرق واسناد سے بحث کی ہے۔ اگرچہ اہل سنت کے بہت سے راویوں نے حدیث غدیر کو صحیح مانا ہے لیکن طبری نے اس سلسلہ میں ایک مفصل کتاب لکھ ڈالی ہے اور یہ

۱۔ البتہ یہ کہ وہ ایک انصاف پسند شخص تھے اور اہلبیتؑ سے انحراف کے باوجود اس وقت بغداد میں موجود حنبلی سنیوں کے پیرو نہ تھے اور اسی لئے اہلبیتؑ کی جانب بھی متوجہ تھے اس میں ہرگز شبہ نہیں ہے۔ ۲۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال، جلد ۲ ص ۴۹۹

اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انھوں نے حدیث غدیر کو کتنی زیادہ اہمیت دی ہے۔ علمائے شیعہ میں نجاشی اور طوسی ہر دو بزرگواروں نے اس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے (۱) ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ جب طبری نے سنا کہ ابن ابی داؤد نے حدیث غدیر کو غلط قرار دیا ہے تو اس نے ایک کتاب فضائل (اہل بیت) اور حدیث غدیر کی صحت میں لکھی۔

اس کے بعد اس نے اضافہ کیا ہے کہ: "میں نے بھی حدیث غدیر کے طُرُق سے متعلق ایک جلد دیکھی اور اس کی وسعت اور کثرت طرق کو دیکھ کر گھبرا گیا،، (۲) اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ "طبری نے اہل بیت کے سلسلے میں ایک مسند بھی لکھی ہے جیسا کہ اس نے دیگر صحابہ کے سلسلہ میں بھی (مسندیں) لکھی ہیں (۳)

یاقوت حموی نے بھی تائید کی ہے کہ طبری نے ایک کتاب فضائل (اہل بیت) میں لکھی ہے اور اس کی ابتدا میں حدیث غدیر کے طرق اکٹھا کئے ہیں اگرچہ یہ کتاب اتمام کو نہیں پہنچ سکی۔ (۴)

اس نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ بغداد کے شیوخ میں سے ایک شیخ نے حدیث غدیر سے انکار کیا تھا (اس کی مراد ابن ابی داؤد ہی ہیں البتہ اس نے نام نہیں لیا ہے) لکھا ہے کہ: اس شخص نے کہا تھا کہ جس وقت پیغمبر اسلام (ص) غدیر خم میں تھے علی (ع) یمن میں رہ رہے تھے اور اس سلسلہ میں کچھ جھوٹے اشعار بھی وضع کئے تھے۔ طبری نے اس کے جواب میں علی (ع) کے فضائل نقل کرتے ہوئے حدیث غدیر کے طرق بیان کئے، احادیث سننے کی غرض سے کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو گئے اور روافض میں سے بھی ایک گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو گیا.... لہٰذا انہوں نے ابوبکر و عمر کے فضائل شروع کئے بعد میں عباسیوں نے ان سے خواہش کی کہ عباس کے فضائل بھی بیان کریں لیکن اس کا املا کرنا انھوں نے ابھی تمام بھی نہیں کیا تھا کہ اجل نے ان کو مہلت نہ دی۔ (۵)

۱۔ نجاشی ص ۲۲۵، الطوسی۔ الفہرست ص ۱۵۰ ۲۔ ذہبی۔ "تذکرۃ الحفاظ" جلد ۲ ص ۷۱۳۔

۳۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۷۱۳۔ ۴۔ یاقوت حموی۔ "معجم الادباء" جلد ۱۷ ص ۸۱۔

۵۔ یاقوت حموی۔ "معجم الادباء" جلد ۱۷ ص ۸۲۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یاقوت کی آخری باتیں کہاں تک صداقت رکھتی ہیں جبکہ ان میں تناقض بھی پایا جاتا ہے بہر حال طبری کا حدیث غدیر کے تئیں اتنا اہتمام اور "کتاب الولایۃ" کے عنوان سے ایک کتاب کی تالیف کہ جو طرق حدیث غدیر پر محیط ہے اس کی طرف رفض کی نسبت کے مسئلہ میں ایک اہم کڑی ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ اہم کتاب ذہبی کے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی مگر اس کے بعد اس کا پتہ نہیں ملتا۔ (۱)

اسی طرح طبری نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں حدیث طیر کے طرق جمع کئے ہیں یہ وہ حدیث ہے جس میں بیان کرتے ہیں کہ جس وقت پیغمبر اسلامؐ نے ایک "طیر مشوی" (بھنا ہوا پرندہ) کھانا چاہا تو شروع کرنے سے پہلے خداوند عالم سے دعا کی کہ اپنے بہترین بندہ کو بھیج دے جو آپؐ کے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے اتنے میں حضرت علیؑ وارد ہوئے۔ (۲)

اس سے قبل بھی، موجودہ فقہی مذاہب (۳) کی پیروی نہ کر کے طبری کا خود ایک مستقل فکر رکھنا طبری کی روح کی آزادی کا پتہ دیتا ہے چنانچہ فطری طور پر حدیث غدیر کے سلسلہ میں اہتمام، عجب نہیں ان کی ہدایت کا باعث بنا ہو خصوصاً جبکہ وہ آملی بھی تھے اور اس علاقہ میں شیعیت بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔

ہمارا مقصد طبری کو، ان معنوں میں جو ہمارے درمیان عام طور پر رائج ہے، صد در صد شیعہ امامی ثابت کرنا نہیں ہے۔ لیکن وہ اس صورت حال سے بہت قریب تھے اور شاید آخر عمر میں اس منزل تک پہنچ بھی گئے ہوں۔

تیسری صدی ہجری میں ایک مشہور روایت لوگوں کے زبان زد تھی، کہا جاتا تھا کہ:۔

"ارنی شیعیاً صغیراً اراک رافضیاً کبیراً" (۴)

۱۔ شاید اب بھی موجود ہو اور ہم کو اطلاع نہ ہو۔

۲۔ القمی۔ الکنیٰ والالقاب جلد اول ص ۲۳۱، العاملی۔ اعیان الشیعہ جلد ۹ ص ۱۹۹ طبع جدید۔

۳۔ ابن ندیم۔ الفہرست ص ۲۹۱

۴۔ الاسکافی۔ المعیار والموازنہ، تصحیح الشیخ المحمودی۔ طبع بیروت ص ۳۲

"یعنی تم مجھے چھوٹے سے چھوٹا شیعہ دکھادو میں (اسی سے) ایک بڑا رافضی تمہارے سامنے لاکھڑا کروں گا۔"

یہ ایک حقیقت ہے کیونکہ جو شخص حدیث غدیر کا اس وسیع پیمانے پر مشاہدہ کرے اور ایک چھوٹا موٹا شیعہ نظر آئے وہ آخر کار ایک بڑا رافضی بھی ہو جائے گا۔

بغداد میں حنبلیوں نے جو پابندیاں ایجاد کر رکھی تھیں اس نے یقینی طور پر ان کے سامنے تقیہ کا مسئلہ پیدا کر رکھا تھا اور شاید اسی لئے ان کی زندگی کے آخری ایام میں مسئلہ واضح طور پر سامنے نہیں آسکا طبری کے مذہب عامہ پر ہونے کی شہرت ان کی تالیفات بالخصوص ان کی تاریخ و تفسیر کی بنا پر ہے جو مسلمانوں خصوصاً اہل سنت حضرات کی اہم ترین میراث میں سے ہے لیکن طبیعی طور پر ممکن ہے کہ وہ اپنی آخر عمر میں اس حالت سے رو گرداں ہو گئے ہوں جیسا کہ اس کے قرائن و شواہد بھی موجود ہیں اور ان کے بھانجے خوارزمی نے بھی ان کے رافضی ہونے پر زور دیا ہے، خصوصاً اگر تاریخ و تفسیر میں اہلبیتؑ کی طرف سے طبری کے سخت تعصب اور بعد کی تحریروں میں اہل بیتؑ کے دفاع کی روش کو پیش نظر رکھیں تو فیصلہ آسان ہوگا۔

طبری کے آثار

تفصیل کے ساتھ طبری کی کتابوں کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے اس سلسلہ میں یاقوت حموی نے طبری کی کتابوں کی شناخت سے متعلق چند روایات نقل کرتے ہوئے کتابوں کے تعارف کے ذیل میں چند باتیں لکھی ہیں جو بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں (۱) اس نے طبری کی جن کتابوں کا نام لیا ہے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن ۲۔ الفصل بین القرآئۃ ۳۔ کتاب القراءات (یہ شاید سابق الذکر کتاب سے الگ ہے) ۴۔ تاریخ طبری ۵۔ کتاب ذیل المذیل (یہ کتاب صحابہ اور تابعین کے حالات زندگی پر مشتمل ہے) ۶۔ اختلاف علماء الامصار فی احکام شرائع الاسلام (اس میں علماء کے فقہی عقائد کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے) کتاب الشروط ۸ کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام (خود طبری اسی کتاب پر زیادہ تکیہ کرتے تھے ان کی یہ کتاب۔ فقہ کے مختلف

۱۔ یاقوت جلد ۱۸ ص ۵۴ - ۹۳

ابواب پر مشتمل ہے، اس کتاب کی مختصر بھی "الخفیف فی احکام شرائع الاسلام" کے نام سے موجود تھی ۔
۹۔ کتاب تہذیب الآثار (یہ ابھی حال میں ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے) ۱۰۔ کتاب ادب النفوس الجیدۃ والاخلاق النفیسہ (یہ بھی ان کے دینی اور اخلاقی خدمات میں شمار کی جاتی ہے اس کے مطالب کی شرح کا ذکر یاقوت نے کیا ہے) ۱۱۔ کتاب "المسند المجرد" ۱۲۔ کتاب البصیر (التبصیر) فی الدین (جو گویا مختلف فرقوں کی رد میں ہے اعراب بھی موجود ہے) ۱۳۔ کتاب فضائل علی بن ابی طالب (اس میں حدیث غدیر کے طرق جمع کئے ہیں) ۱۴۔ کتاب الرد علی الحرقوصیہ" ۔ (نجاشی نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے ۔ (۱)

نیز کچھ دوسرے رسالے بھی اس نے طبری کی جانب منسوب کئے ہیں منجملہ ان کے "کتاب العدو التنزیل اور الرد علی ذی الاسفار" ہے ان میں سے کچھ ہی کتابیں آج دستیاب ہیں اگرچہ بہت سے دوسرے علما کے تصنیفات کے مقابلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ طبری کے تالیفات نسبتاً زیادہ محفوظ رہ گئے ہیں ۔

بروکل مین نے بھی طبری کی باقی ماندہ کتابوں کا ذکر کیا ہے منجملہ ان کے "تاریخ طبری نیز دوسرے مصنفین کے ذریعہ لکھے ہوئے اس کے کچھ تکملے یا تتمے ہیں اسی طرح اس نے تاریخ طبری کے مختلف ایڈیشنوں نیز اس کے جو ترجمے یا تلخیص ہوئی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، بروکل مین نے طبری کی دوسری کتاب تہذیب الآثار کے نام سے ذکر کرنے کے بعد (۲) تفسیر طبری کے مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں اور ترجموں کا ذکر کیا ہے اس نے طبری کی ایک اور کتاب "اختلاف الفقہاء" کا نام لیا ہے جس کے چار جزو ہیں ان کا ایک نسخہ یا کچھ حصے اب بھی موجود ہیں (۳)

بروکل مین اس کے بعد لکھتا ہے : کتاب تبصیر اولی النہی و معالم الہدیٰ مخطوطہ شکل میں محفوظ ہے ۔[۴]

۱۔ رجال نجاشی میں ص ۲۲۵، نیز ملاحظہ فرمائیں بروکل مین۔ تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۵۰ ترجمہ عبد الحلیم نجار مطبوعہ دار المعارف مصر۔ ابن ندیم نے بھی طبری کی کتابوں کی فہرست لکھی ہے ۔ الفہرست ص ۲۹۱ نیز داؤدی کی کتاب طبقات المفسرین، ملاحظہ فرمائیں جلد ۲ ص ۱۱۱ ۔

۲ ۔ بروکل مین تا تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۴۹ ۳۔ ایضاً

۴۔ بروکل مین ۔ تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۵۰ ۔

اس نے گویا غلطی سے کتاب بشارۃ المصطفیٰ جو شیعہ طبری آملی کی تصنیف ہے، مؤرخ طبری کی طرف منسوب کردی ہے۔(۱)

فواد سزگین نے بھی طبری کی باقی ماندہ کتابوں اور ان کے مخطوط نسخوں سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کئے ہیں، منجملہ ان کے تاریخ طبری کے نسخوں کی فہرست کافی مفصل ہے (۲) اس نے تاریخ طبری اور اس کے ترجموں سے متعلق بھی کئی باتیں بیان کی ہیں پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بروکلمین کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے، تصحیح اور اپنی طرف سے مزید معلومات کے ساتھ طبری کی باقی ماندہ کتابوں کے نام اس طرح ذکر کئے ہیں:۔

"صریح السنۃ"، "رمی القوس"، "العقیدہ"، "الجامع فی القراءات المشہورہ والشواذ" کہ جس میں شبہ پایا جاتا ہے، کتاب "حدیث الہمیان" نیز "الرسالۃ من لطیف القول فی البیان عن اصول الاحکام" یعنی مجموعی طور پر ان کی کل گیارہ کتابیں باقی رہ گئی ہیں۔(۳)

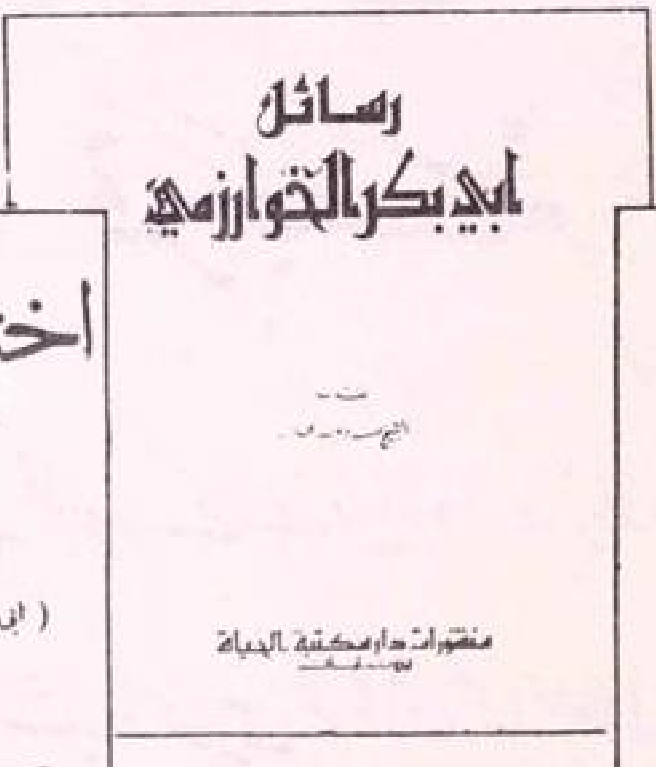

۱۔ بروکلمین۔ تاریخ الأدب العربی جلد ۳ ص ۵۰۔

۲۔ سزگین۔ تاریخ التراث العربی ترجمہ محمود فہمی حجازی مطبوعہ حجاز ۱۹۸۳ جلد اول جزو دوم ص ۱۶۲۔

۳۔ ایضاً جلد اول، جزو دوم ص ۱۶۷ و ۱۶۸۔

عليهما السلام

قَالَ الحُجَّۃ بن الحَسَن

وَأَکثِرُوا الدُّعَاءَ

بِتَعجِیلِ الفَرَجِ فَاِنَّ ذَالِکَ

فَرَجُکُم

جلد از جلد ظہور کے لئے زیادہ سے زیادہ دعائیں کرو

کیونکہ بلاشبہ اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے ۔

کمال الدین / ج ۲ / ص ۴۸۵

امام خمینی قدس سرہ نے فرمایا

صدر اسلام سے آج تک ہمیشہ ہر طرح کی تحریکوں نے مسجد سے ہی ظہور کیا ہے۔ یہ مسجد ہی ہے جس نے کفر اور شرک کے خلاف متحدہ طاقت کو وجود بخشا اور آپ حضرات جو اہل مسجد ہیں اپنی مسجدوں کو اسلام اور اسلامی تحرک کی بنیاد پر، کفر و شرک کے ہاتھ قطع کرنے اور ظالموں و ستم گروں کے مقابلہ میں کمزور و ستم رسیدہ افراد کی حمایت کا وسیلہ قرار دیجیے۔ ہم اگرچہ بے ساز و سامان تھے لیکن خداوند عالم کی مشیت اور اتحاد و یگانگت کی برکت سے طاغوتی طاقت اور طاغوتوں پر غالب آئے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ مجھے امید ہے کہ تمام اسلامی قومیں اٹھ کھڑی ہوں گی اور اتحاد و یکجہتی نیز اسلام پر یقین و اعتماد رکھتے ہوئے، اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے دشمنوں پر اور ان لوگوں پر جو قوموں ملتوں کو اپنی قید و غلامی میں رکھنا چاہتے ہیں غالب آجائیں گی"

(۲۷، ۲، ۵۸)

امام کی ایک تقریر سے اقتباس